

## غلامی کی قیمت

بجائے فرمایا ہمارے سپہ سالار نے جب انہوں نے ان بیرونی قوتوں اور ایجنسیوں کو وارننگ دی جو بلوچستان وغیرہ میں مداخلت سے پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ سفارتی مجبور یوں کی وجہ سے انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن یہ ایک اوپن سیکرٹ ہے جسے سب جانتے ہیں اور صحافیوں و دانشوروں کے علاوہ حزب اقتدار و اختلاف کے کئی اہم سیاستدان سرعام بھارت و افغانستان اور ان دونوں کے پیچھے اصل قوت محرکہ امریکہ اور اس کے حلیف ممالک (یورپ و اسرائیل) کا ذکر کر چکے ہیں۔

ہم پچھلے دنوں کراچی یونیورسٹی گئے تو وہاں معروف دانشور سید خالد جامعی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو پاکستانی معاشرے میں بڑھتے ہوئے مغرب کے تہذیبی اثرات بھی زیر بحث آئے۔ جامعی صاحب کی رائے تھی کہ اس میں نیا پن کیا ہے؟ ہم پہلے دن سے امریکی لابی کے ساتھ ہیں بلکہ مغرب نواز پالیسی خود بانیان پاکستان حضرت قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کی طے کردہ ہے۔ ہم نے کہا کہ اس مغرب پرستی کی آخر کوئی حد تو ہونی چاہیے؟ وہ کہنے لگے: جب غلامی قبول کر لی تو حد کیسی؟ غلامی کی کوئی حد و نہیں ہوتی۔ آقا جو کہے وہ ماننا پڑتا ہے۔

اُس وقت تو بحث کو تسمیٰ کی خاطر ہم خاموش ہو گئے لیکن بعد میں ہم سوچتے رہے کہ کیا واقعی غلامی کی کوئی حد و نہیں ہوتی؟ ہم نے اپنی تاریخ پر نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ پہلے لیاقت علی خاں نے گولی کھائی۔ پھر جنرل محمد ایوب خاں نے اقتدار سنبھالا۔ وہ پرو مغرب تھے لیکن انہیں آخر میں ”فرینڈز ناٹ ماسٹرز“ لکھنا پڑی۔ بھٹو کو امریکہ کو لٹکانے پر پھانسی قبول کرنا پڑی (اگرچہ ان کے دوسرے بہت سے گناہ ایسے تھے جو انہیں کئی پھانسیوں کا مستحق بناتے تھے) ضیاء الحق فوجی حکمران تھے لیکن امریکی مفادات سے انکار کے نتیجے میں بالآخر زیرِ زہرہ ہو کر شہید ہوئے۔ نواز شریف نے امریکہ کی مرضی کے خلاف ایٹم بم بنایا تو ملک بدر ہوئے۔ جنرل مشرف بھی فوجی حکمران تھے اور وہ امریکہ کی ایک دھمکی کے آگے ریت کی طرح بکھر گئے۔ ان کے بعد آنے والے سیاسی حکمرانوں اور فوجی سربراہوں نے خاموشی سے امریکی احکام کے آگے سر جھکانے کی پالیسی جاری رکھی۔

سوال یہ ہے کہ اس امریکی غلامی کی قیمت کیا ہے؟ کیا امریکہ اور مغربی قوتوں کی مدد سے اقتدار میں آنا؟ یا اقتدار کو طول دینا یا منصب حاصل کرنا اور اس میں توسیع حاصل کرنا؟ یا بہت سے امریکی ڈالر کا حصول؟ دنیا داری کے لحاظ سے یہ اچھی قیمت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی صاحب اقتدار و منصب کے لیے ملکی مفادات و قومی استحکام کی بھی یہ مناسب قیمت ہے؟ اور کیا کسی مسلمان کے ایمان یا شریف آدمی کے ضمیر کی بھی یہ مناسب قیمت ہے؟ ہمارے خیال میں تو نہیں..... تاہم ضروری نہیں کہ ہر آدمی کو ہم سے اتفاق ہی ہو۔

## تعلیم و تربیت - خالد جامعی صاحب کا نقطہ نظر

تعلیم پر کراچی کے معروف اسلامی دانشور سید خالد جامعی صاحب کا مضمون البرہان نے سابقہ چار شماروں (جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء) میں ’اسلامی سکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں‘ کے عنوان سے طبع کیا۔ جامعی صاحب اگر مضمون کے آخر میں اس کا ملخص پیش کر دیتے تو مناسب ہوتا۔ ان چند سطور میں ہم اس مضمون کا خلاصہ اور حاصل قارئین کے سامنے رکھنے کی کوشش کریں گے۔

جامعی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ مغربی تعلیم اہل مغرب کی فکر و تہذیب اور ان کے تصور علم اور ورلڈ ویو کی پیداوار ہے۔ یہ ورلڈ ویو اور یہ تصور علم جن اصول و اقدار پر اپنی تہذیب کی بنیاد رکھتا ہے اور اس تہذیب کو مطلوب فرد تیار کرنے کے لیے جو تعلیمی فریم ورک دیتا ہے وہ اپنی کنہ میں غیر اسلامی ہے اور اسلامی اصول و اقدار اور اسلامی فکر و تہذیب کی نفی کرتا ہے۔ اس فکر و تہذیب نے خود اہل مغرب کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے اور وہ اس کے پیدا کردہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود مغرب اپنی فکر و تہذیب کو نہ صرف دیدہ زیب اور پرکشش بنا کر پرامن ذرائع سے (جیسے قرضوں کی معیشت، بہبود آبادی، جمہوریت، میڈیا و ابلاغ عامہ اور سب سے بڑھ کر تعلیم کے ذریعے) دوسروں خصوصاً مسلمانوں کو برآمد کر رہا ہے بلکہ جہاں ضرورت پڑے اسے اپنی مہیب فوجی قوت سے بھی مسلمان معاشروں پر اسے تھوپنے کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کا رد عمل یہ ہے کہ ان کے ارباب اقتدار اور اہل دانش اس ساحرہ کے عشوہ و غمزہ و ادا کے آگے ڈھیر ہو چکے ہیں اور اس کے اگلے ہوئے کو ہیرے و جواہر سمجھ کر سمیٹ رہے ہیں اور ان کے تعلیمی نظام اور نصابی کتب کو خوشی اور فخر سے اپنا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اپنی جذور سے دست بردار ہو جائیں۔ چنانچہ دو متضاد نظام ہائے فکر و عمل کو اپنانے کے نتیجے میں نسل نو فکری ژولیدگی اور ذہنی انتشار کا شکار ہو رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ شخصیت کی شکست و ریخت، بے کرداری اور مغرب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی ہے۔

خالد جامعی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مغربی تہذیب کے پروردہ بعض عناصر اس مادہ پرست تہذیب کے محبس سے باہر آنے کی کوششیں کر رہے ہیں تو ہم مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہم اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کرتے؟

## عملی اقدامات کی ضرورت

یہ خلاصہ تھا جامعی صاحب کی فکر کا۔ اب ہم عرض کرتے ہیں کہ مغرب کی مادہ پرست فکر و تہذیب کو شعوری طور پر رد کرنے اور اسلامی اصول و اقدار کو شعوری طور پر اپنانے کے لیے مسلم معاشرے میں ایک ذہنی تبدیلی اور فکری انقلاب لانے کی ضرورت ہے جس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے نظام تعلیم و تربیت۔

ہم ربع صدی سے 'تحریک اصلاح تعلیم' کے تحت مغرب کے اس تعلیمی جال سے عملاً باہر آنے کے لیے مختلف تجویزیں پیش کر رہے ہیں اور ان پر عمل درآمد کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن ہمیں حکومت تو رہی ایک طرف افراد معاشرہ کی طرف سے اور خصوصاً اسلامی تعلیم کی خواہش رکھنے والے عناصر کی طرف سے بھی کوئی تعاون نہیں مل رہا۔ 'اصحاب مال' کی کمی اس معاشرے میں نہیں ہے لیکن مادہ پرستی اور کمرشلائزیشن کے اس دور میں 'اصحاب حال' کی کمی ضروری ہے ورنہ مغربی فکر و تہذیب کی بالادستی کو رد کرتے ہوئے ایک نیا رول ماڈل تعلیمی ادارہ (سکول تا یونیورسٹی) قائم کرنا کون سا بڑا کام ہے؟ اس معاشرے میں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک یونیورسٹی بنا سکتا ہے اور کچھ تو بنا بھی رہے ہیں لیکن پیسے کے لیے، کاروبار کے طور پر..... اور خدا کا کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو مغربی فکر و تہذیب، مغربی نظام تعلیم و تربیت اور کمرشلائزیشن و مادہ پرستی کو رد کرتے ہوئے ایک سکول اور یونیورسٹی اسلامی تناظر میں اور اسلامی اہداف کے لیے بنانے کے لیے تیار ہو تا کہ مغرب زدہ علی گڑھ ماڈل اور دینی مدارس کی تنکنا نیوں سے نکل کر ایک قابل عمل اور معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا نیا رول ماڈل تعلیمی ادارہ قائم کیا جاسکے۔ سکولوں کے لیے اسلامی تناظر میں نصابی کتب کی تیاری اور تربیت اساتذہ کے پراجیکٹ ہمارے پاس تیار پڑے ہیں لیکن ان کے لیے وسائل مہیا کرنے والا کوئی نہیں! نہ 'اصحاب خیر' اپنی روش بدلنے کو تیار ہیں اور نہ قوم اپنی بے حسی کو خیر باد کہنے پر آمادہ ہے فالی اللہ المشتکی۔

## فارمی چوزے

ہماری قوم کے لوگوں کی حالت ان فارمی چوزوں جیسی ہو چکی ہے جو اپنے

ساتھی کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھنے کے باوجود ذبح ہونے والے ترازو سے چھلانگ

تک نہیں لگا سکتے۔

## فروغ تعلیم کے بغیر مغربی سازشوں کا توڑ ممکن نہیں

**سوال:** نائن الیوں اور سیون سیون کے بعد مغربی دنیا اسلام اور مسلمانوں کو اپنی تہذیب کے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔ مغرب میں بڑھتے ہوئے اسلاموفوبیا کا آخر نتیجہ کیا نکلے گا؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** یہ طے شدہ بات ہے کہ نائن الیوں، سیون سیون اور چارلی ہبڈ جیسے واقعات نیٹو کی ایجنسیاں کرواتی ہیں۔ اس پر تحقیقی کام موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد نیٹو نے سلپنگ آر میز چھوڑی ہوئی ہیں جو عوام کو دبانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ایسے واقعات کے ذریعے شخصی آزادیاں جو مغرب کے لوگوں نے بڑی مشکل سے حاصل کی ہیں، سلب کر لی جاتی ہیں۔ جونہی کوئی واقعہ ہوتا ہے، ایک نئی قانون سازی ہو جاتی ہے۔ اسلاموفوبیا اس لیے ہے کہ دنیا میں توانائی کے ۷۰ فیصد وسائل مسلمان ملکوں میں ہیں۔ یہ سب اس لیے کیا جا رہا ہے تاکہ مغربی ممالک کے عوام میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہو۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے کا الزام مسلمانوں پر لگا دیا جاتا ہے۔ عراق اور لیبیا پر حملہ جھوٹ بول کر کیا گیا۔ نائن الیوں بھی سراسر جھوٹ تھا۔

مسلمانوں کی اجتماعی ناتوانی کا تعلق ان کی اجتماعی بے علمی سے ہے۔ پچھلے دو تین سو برسوں میں نئے علم کی تخلیق میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے، جب کہ قرآن کے دستور العمل کا یہ بہت اہم جزو ہے۔ قرآن نے تو بار بار فطرت کے مطالعے پر زور دیا ہے۔ ۵۰ آیات مظاہر فطرت کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان میں سوچنے والی قوموں کے لیے بہت سے اشارات موجود ہیں۔ لہذا تمام قوت، تمام دولت، تمام عزت آپ کے صاحب علم ہونے سے جڑی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس کائنات پر توجہ کرنا از روئے قرآن مسلمان پر فرض ہے۔

**سوال:** عالمی قوتیں عسکری اور اقتصادی طور پر مضبوط اسلامی ملک کو اپنے لیے خطرہ تصور کرتی ہیں۔ کیا آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** یہ ان کی پالیسی کا حصہ ہے۔ وہ کسی اسلامی ملک میں عسکری اور اقتصادی دونوں قوتیں بیک وقت یکجا نہیں ہونے دیتے۔ اگر کوئی مسلمان ملک اقتصادی طور پر مضبوط ہے تو وہ

☆ وائس چانسلر جامعہ پنجاب، لاہور

تنظیم اسلامی کو دیے گئے ایک ویڈیو انٹرویو کے اقتباسات بشکریہ ندائے خلافت

عسکری طور پر کمزور ہوگا، اور عسکری طور پر مضبوط ہے تو اقتصادی طور پر اس کے حالات اچھے نہیں ہوں گے۔ عراق میں دونوں چیزیں موجود تھیں تو اس کو انہوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ پاکستان عسکری طور پر اگرچہ مضبوط ہے لیکن اقتصادی طور پر حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو اس پر سوچنا چاہیے کہ انہوں نے اس چیلنج سے کیسے نبھنا ہے!

**سوال:** عراق اور شام میں داعش پوری طرح سرگرم عمل ہے۔ آپ اس کی سرگرمیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** مسلمانوں میں ایک عرصے سے یہ امنگ موجود ہے کہ ہم ایک ہو جائیں، ہمارا کنٹرول ایک جگہ ہو، جیسا کہ خلفائے راشدین کے دور میں تھا۔ اس بات کو مغرب کے منصوبہ ساز بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ لہذا وہ ہر ایسی تحریک میں جو مسلمانوں کی بہتری کے لیے چلتی ہے، اپنا کردار ادا کرنے لگتے ہیں اور بالآخر وہ فساد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ جتنی بھی تحریکیں ہیں ان میں بہت سے لوگ اخلاص کی بنیاد پر شامل ہوتے ہیں لیکن یہ تمام کی تمام مسلمان ملکوں کو منہدم کرنے کے لیے استعمال ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد ایک فساد، افراتفری اور کنفیوژن پیدا ہو جاتی ہے۔ عرب سپرنگ شروع ہوا تھا تو میں نے کہا تھا کہ مغرب نے جس چیز کی پرورش کرنی ہوتی ہے، اسے اس کا میڈیا ہوا دیتا ہے جب کہ جس چیز کو وہ نہیں چاہتے کہ وہ ہو، ان کا میڈیا اس کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ چونکہ میڈیا عرب اسپرنگ کی بہت زیادہ بات کر رہا تھا تو اس کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے سامنے ہے۔

جہاں تک داعش کا تعلق ہے، اس کی سرگرمیاں عراق اور شام کے حصے بخرے کرنے پر منتج ہوں گی۔ انہوں نے جو اسلامی سلطنت قائم کی ہوئی ہے، اس کو اہل مغرب جب چاہیں گے دبا دیں گے اور وہ صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت ہوگی بھی نہیں۔ ایسے لوگ کبھی قوموں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف نہیں لے جاسکتے۔ یہ تاریخ میں کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ جس قیادت نے کسی قوم کو بے علمی، جہالت اور پستی کے گڑھے سے نکال کے عروج کے راستے کی طرف گامزن کیا ہے وہ ہمیشہ روشن خیال، عالی دماغ اور باکردار ہوتی ہے۔ آج کے مسلمانوں میں کردار کا مفہوم ہی مسخ ہو گیا ہے۔

**سوال:** مشرق وسطیٰ میں طویل بادشاہتوں کے خاتمے کے لیے ”عرب سپرنگ“ کے نام سے ایک منظم اور طاقت ور تحریک برپا کی گئی۔ اس تحریک کے پس پردہ کیا مقاصد کارفرما تھے؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** مسلمان ملکوں کو انتشار کا شکار کر کے وہاں ایک خلفشار کی صورت پیدا کرنا اور ان کو اقتصادی طور پر بے حال اور مقروض کر دینا۔ جو ملک مغربی ممالک سے قرضہ لے لیتا ہے وہ ان

کے شکنجے سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ اگر ملائیشیا بچا ہے تو صرف اس لیے کہ مہاتیر محمد نے ان سے قرضہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ انڈونیشیا نے قرضے لے لیے تھے تو آج تک اس کے حالات سیدھے نہیں ہو رہے۔ قرضے کی غلامی میں جکڑنا ان کا بہت اہم ہتھیار ہے۔

**سوال:** امریکی اور نیٹو فورسز کی افغان مشن سے واپسی کے بعد کیا آپ اس خطے میں طالبان افغانستان کا دورانی اور اسلام کا احیاء دیکھ رہے ہیں؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** اسلام کے صحیح فہم اور صحیح عمل کے نتیجے میں دو چیزیں وجود میں آتی ہیں، یعنی قوم صاحب علم بھی ہوگی اور عسکری طور پر بھی مضبوط ہوگی۔ افغانوں میں عسکریت کی روح موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی اور اسی حمیت کی بنیاد پر انہوں نے امریکہ اور نیٹو کا مقابلہ کیا ہے لیکن انہوں نے مستعار ہتھیاروں سے جنگ کی ہے۔ یہ ہتھیار مغرب نے بنائے ہیں، افغانوں نے نہیں۔ ان کو بہادری اور شجاعت کی بنیاد پر قدرت نے مہلت دی، لیکن اگر وہ اپنا طرز عمل درست نہیں کریں گے یعنی علم کی طرف راغب نہیں ہوں گے اور اپنے اندر وسیع القسمی پیدا نہیں کریں گے تو پھر ان کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اس پر امریکہ کام کر رہا ہے۔ مسلمان محسوس ہی نہیں کر رہا کہ وہ کس طرح سے کام کر رہے ہیں۔ فرقہ واریت وغیرہ ہمیں ہلاکت کی طرف لے جا رہی ہے۔ جب تک ہمیں روشن خیال، سادہ اور اسلام کے صحیح فہم کو اپنانے والی قیادت نہیں ملے گی، اس قسم کے جھگڑوں سے بالآخر دشمن ہی فائدہ اٹھائے گا۔ اس وقت اکثر مسلم ممالک میں فساد ہو رہا ہے، جس میں غیروں کی سازش کے علاوہ ہمارے اپنے کردار کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ہماری سوچ اور فکر میں مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں توحید کا تصور مسخ ہو چکا ہے۔ توحید صرف پتھر کے بتوں کو توڑنے کا نام نہیں۔ اقبال کا شعر ہے۔

براہمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے

ہوں چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اب ہم حب ذات، حب مال، آرام طلبی کے بتوں کے احکام کی تعمیل میں ہر وقت مشغول رہتے ہیں۔ خدا کو یہ سخت ناپسند ہے کہ اس کی بجائے کسی اور کے احکام کو مانا جائے۔ قرآن ہدایت کی کتاب ہے لیکن ہم نے اسے حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کے لیے رکھا ہوا ہے۔ اس سے ہم خدا کی ذات کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ نبی اکرم ﷺ کا کردار ہمارے لیے ایک نمونہ ہے، جسے ہر لحظہ ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ لوگوں کی مدد کرنا، ان کا دکھ سمجھنا، ایثار کرنا، یہ ساری چیزیں آج ہمیں پیدا کرنی ہوں گی۔ ہر بات پر تشدد کرنے، لڑنے اور بندوق اٹھالینے کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ جب اسلام نے صاف کہہ دیا کہ جس

نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے ساری انسانیت کا قتل کیا تو کسی کا قتل جائز نہیں ہے۔

**سوال:** کچھ عرصہ پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ اگر امریکہ نے ایران پر حملہ کیا تو تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی، لیکن بعض لوگوں کی رائے میں یہ کشیدگی مصنوعی تھی۔ اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** پہلی بات یہ ہے کہ امریکہ ایران کو معاف نہیں کرے گا کیونکہ ایران کے پاس تیل کے ذخائر ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایران کا ایک نیوکلیر پروگرام ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کسی وقت بھی عسکری طور پر ایٹمی طاقت بن جائے گا۔ اگر امریکہ کو شام میں کامیابی حاصل ہو گئی تو وہ بالآخر ایران کی طرف جائے گا۔ اس حوالے سے ایک بڑی جنگ شروع ہونے کا امکان بہت زیادہ ہے۔ اس وقت جو تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں، یہ عارضی ہیں۔ ان سے اہل مغرب کا مقصد تبدیل نہیں ہوگا۔

**سوال:** کیا آپ پاکستان میں جاری نظام تعلیم سے مطمئن ہیں؟ تعلیم کی مد میں جو بیرونی امداد ہمیں مل رہی ہے، کیا اس سے نظام تعلیم بہتر ہو سکتا ہے؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** بیرونی ذرائع سے جو امداد ملتی ہے وہ ہمیشہ آپ کی ملی حیثیت اور عسکری روح کے خاتمے کے لیے ہوتی ہے۔ میں اس سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ ہمارے ہاں ایک نظام تعلیم ہونا چاہیے، جسے ہم خود ترتیب دیں اور اس کا نصاب خود بنائیں۔ بیرونی امداد کبھی بھی غیر مشروط نہیں ہوتی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔ ایسی امداد نے ہماری تسلیں تباہ کی ہیں۔ کیا ہماری حکومتوں کو اس کا شعور نہیں ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک متوازن نظام تعلیم ہونا چاہیے۔ ایک ہی زبان میں ہمیں پڑھنا چاہیے۔ تعلیم عام ہونی چاہیے۔ ہمارے ملک میں کروڑوں بچے ایسے ہیں جو غربت اور حکومتی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے سکول میں ایک دو جماعت سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ حکومت تعلیم پر صرف ۲ فیصد کے قریب خرچ کر رہی ہے۔ تعلیم کو نظر انداز کرنے کے نقصانات آج ہمیں ہر طرف نظر آرہے ہیں۔ ایک بچہ دینی مدرسے میں پڑھا ہے، ایک بچہ عام سکول میں پڑھا ہے، جب کہ ایک بچہ اولیول رائے لیول کے دھارے میں بہہ کے آیا ہے۔ آپ ان کو ایک میز پر بٹھا دیں تو وہ آپس میں بات ہی نہیں کر سکتے۔

**سوال:** کیا پاکستان میں یکساں نصاب تعلیم رائج کیا جاسکتا ہے؟ آپ کے خیال میں وہ نصاب تعلیم کیسا ہونا چاہیے؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** اگر عزم ہو اور نقشہ ذہن میں ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ ایسا بتدریج بھی ہو سکتا ہے اور یک لخت بھی ہو سکتا ہے۔ اس پر ارباب اقتدار کو کام کرنا پڑے گا۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور شہر

میں پنجاب حکومت نے موٹر سائیکل سواروں کو ہیلمٹ پہنادیے تھے۔ آج کل دس بجے رات شادیاں ختم ہو جاتی ہیں، ورنہ رات کے دو دو بجے تک ہم انتظار کرتے تھے۔ اگر کسی چیز کے بارے میں قیادت کا ذہن واضح ہے تو وہ کر لیتی ہے۔

**سوال:** دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا مقابلہ کیسے کرنا چاہیے؟

**ڈاکٹر مجاہد کامران:** اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم تعلیم اور علم کی طرف مائل ہوں۔ ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ اس وقت جو پاکستان قائم ہے وہ ایٹمی پروگرام کی وجہ سے قائم ہے۔ تخلیق علم اور تعلیم کی طرف ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے، باقی ساری چیزیں بعد میں آتی ہیں۔ اس کے لیے اگر ہمیں سادہ زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے، اپنے آرام قربان کرنے پڑتے ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مغرب اور ہمارے مابین صرف علم ہی کا فرق ہے۔ ہمیں علمی طور پر مضبوط ہونا پڑے گا۔ یاد رکھیں کہ سپر نیوکلینا لوجی علم ہی کی دین ہے۔

### اللہ کو پسند ہے

- ☆ وہ دل جس میں درد ہو ☆ وہ جگہ جہاں اللہ کا ذکر ہو
- ☆ وہ آنکھ جس میں حیا ہو ☆ وہ ہونٹ جن پہ مسکراہٹ ہو
- ☆ وہ شخص جو وعدہ پورا کرتا ہو ☆ وہ آنسو جو خوفِ خدا سے گرے
- ☆ وہ خدمت جو بغیر مطلب کے ہو (ڈاکٹر انوار احمد بگویی)



## پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کا المیہ

تعلیم ترقی کا زینہ ہے تو اعلیٰ تعلیم انسانی جسم میں دوڑتے ہوئے خون کی طرح وہ علمی قوت ہے جو پوری قومی زندگی کو ایسی توانائی مہیا کرتی ہے جو ترقی کے مذکورہ زینے پر اوپر جانے میں مدد دیتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ادارے اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین و حضرات کے بل بوتے پر چلتے ہیں۔ ریسرچ اور ڈولپمنٹ کے اداروں کو مطلوبہ افرادی قوت اعلیٰ تعلیم یافتہ محققین عطا کرتے ہیں۔ سکول، کالج، ہسپتال اور انتظامی دفاتر نیز سماجی خدمت کے ادارے اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی پیداوار سے ہی مستفید ہو کر اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ دورِ حاضر کی نالج اکاڈمی کا انحصار اُن اہل علم پر ہوتا ہے جو اپنے اپنے شعبے میں تخصص حاصل کر کے قوم کی خدمت و راہنمائی کرنے والے اداروں میں عمل پذیر ہوتے ہیں۔ غرض موجودہ دور میں ہر قوم کی ترقی اور سر بلندی اعلیٰ تعلیم کی وسعت اور گہرائی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ سماجی علوم میں جس طرح ہندسی رفتار (Geometric Rate) سے ترقی ہو رہی ہے اس کی کوئی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ مستقبل کا نقشہ کیا ہوگا اس کا کوئی اندازہ لگانا اس لیے ممکن نہیں کہ علمی ترقی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی رفتار ہوش رہا ہے۔ سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا اس کی روشنی میں کوئی قوم تعلیم اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کر سکتی۔

پاکستان میں پچھلے ڈیڑھ عشرہ سے اعلیٰ تعلیم کا مقداری سطح پر بہت فروغ ہوا ہے۔ کالجوں کی تعداد بڑھی ہے۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں یونیورسٹیوں اور ڈگری جاری کرنے والے تعلیمی اداروں (Degree Awarding Institutes) کی تعداد ڈیڑھ سو سے تجاوز کر گئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں داخلے (Enrollment) لاکھوں میں ہیں۔ ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی اسکالرز کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ لاہور، اسلام آباد، پشاور، ملتان، کراچی، کوئٹہ، فیصل آباد، سرگودھا، سیالکوٹ، بہاول پور جیسے بڑے شہروں میں یونیورسٹیوں کے الحاقی ادارے ایم ایس اور ایم فل کی مارنگ، ایوننگ اور ویک اینڈ پروگرامز کے تحت دھڑا دھڑا داخلے کر رہے ہیں۔ چھوٹے ضلعی ہیڈ کوارٹرز کے قصابات تک میں ایسے کالجز کھمبویوں (Mushroom Growth) کی طرح سر اٹھا رہے ہیں جن کی نہ تو بائیر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ رجسٹریشن ہے اور نہ ہی کسی یونیورسٹی کے ساتھ الحاق لیکن متعدد مضامین میں بی ایس، ایم ایس، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے داخلوں کے اشتہار دے کر اپنے نام کے ساتھ ڈگری کا شوق

سجانے والوں سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھ رہے ہیں۔ کہیں ایک یونیورسٹی کا غلغلہ ہے تو کہیں دوسری یونیورسٹی جھنڈے گاڑے ہوئے ہے۔ لاہور کی ایک پرائیویٹ یونیورسٹی نے صرف ایم فل اسلامیات میں ۱۵۰ داخلے کر لیے۔ راقم لاہور کی ایک معروف سڑک کی بنگلی گلی سے گزرا تو لاہور یونیورسٹی کی سرپرستی کا دعویٰ لیے ایک انسٹی ٹیوٹ کا بورڈ پڑھا جس نے ایم فل وغیرہ کے داخلے کر رکھے تھے۔ میں ادارے کے اندر چلا گیا۔ خوبصورت کمرے اور فرنیچر کے ساتھ ادارہ خالی پڑا تھا۔ ایک نوجوان نظر آیا تو اس سے معلومات لینے کی کوشش کی۔ وہ صرف اتنا بتا۔ کا کہ شام کے وقت اور اختتام ہفتہ کلاسیں ہوتی ہیں۔ اس نے ایک بروشر دیا جس پر فیکلٹی کی مختصر سی فہرست تھی۔ میں حیران ہوا کہ سب کے سب پروفیسرز جن کے نام اس بروشر میں شامل تھے وہ لاہور کی دوسری یونیورسٹیوں کے فل ٹائم اساتذہ تھے۔ دو ایک کوفون کر کے پوچھا تو انہوں نے اس ادارے سے کسی تعلق کی تردید کی۔ ہائیر ایجوکیشن میں کھلی جعل سازی کی ایک اور مثال اس طرح ہے کہ میں سرگودھا کے ایک پرائیویٹ کالج کے پرنسپل کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کی ایک خاتون لیکچرار اپنے ٹرانسکرپٹ کی کاپی دفتر میں جمع کرانے آئی۔ موصوفہ نے سرگودھا ہی کے کسی پرائیویٹ کالج سے ایم ایس سی کمپیوٹر سائنس کیا تھا۔ ٹرانسکرپٹ کی کاپی دیکھی تو اس پر کسی کالج یا یونیورسٹی کا نام نہیں تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کالج لاہور کی کسی پرائیویٹ یونیورسٹی کا نام استعمال کرتے ہوئے داخلے کرتا ہے اور وہی یونیورسٹی بے نام قسم کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیتی ہے اور نیچے بڑسٹیمپ لگا کر کوئی جعلی سے دستخط کر دے جاتے ہیں۔ اس طرح اس ملک میں ہائیر ایجوکیشن کے شعبے میں اعلیٰ تعلیم کی جعلی ڈگریاں اور سرٹیفکیٹس جاری کیے جا رہے ہیں۔

جعل سازی تو بہر حال جعل سازی ہے اس سے اعلیٰ تعلیم یافتہ گریجویٹس تو برآمد نہیں ہوں گے اگرچہ اب نا تعلیم یافتہ اعلیٰ ڈگریوں کے حامل لوگوں کی تعداد ہزاروں میں ہوتی جا رہی ہے۔ رہ گئے وہ جو پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کی قانونی یونیورسٹیوں اور قانونی طور پر قائم کیے گئے الحاق شدہ انسٹی ٹیوٹس اور کالجز میں داخلہ لے کر قانونی طور پر جائز ڈگریاں لے رہے ہیں تو ان کی تعلیمی حالت بھی پتلی ہے۔ ایوننگ اور ویک اینڈ پروگرامز میں عام طور پر ملازمت پیشہ خواتین و حضرات داخلہ لیتے ہیں۔ ملازمت کا جھنجھٹ اور گھر و خاندان کی مصروفیات نکال کر ایسے طالبان علم کے پاس وقت ہی کہاں بچتا ہے کہ وہ حصول تعلیم کی طرف سنجیدہ توجہ دے سکیں۔ ادھر اساتذہ کرام کا حال بھی یہ ہے کہ وہ علم کی پوتھی اٹھائے اپنا علم و فضل بانٹنے کے لیے در در گھومتے ہیں اور صبح سے رات گئے تک کئی کئی کلاسیں پڑھاتے ہیں۔ اس طرح ان کے پاس بھی وقت اور توانائی کہاں کہ وہ اپنے آپ کو نئے علم اور نئی تحقیقات کے ساتھ منسلک رکھ سکیں اور مطالعہ میں وسعت پیدا کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرف پرانے علم کی جگالی ہو رہی ہے اور ویسٹرن

تھاٹ (Western Thought) کے پرانے ایڈیشن ہی پتلے سے پتلے ہو کر (یعنی Diluted Form میں) کاغذ کا لے کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں ناچ کلچر (Knowledge Culture) تو کیا پیدا ہوگا بس صرف (Acknowledged Culture) ہی فروغ پا رہا ہے۔ خوف اس بات کا آ رہا ہے کہ یہ نیم خواندہ (Half Baked) یا ناخواندہ (Non Baked) سکالرز جب اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں علمی مسندیں سنبھالیں گے تو پھر ہمیں کن نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا؟ ڈریہ ہے کہ بی ایس، ایم ایس، ایم فل اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں اٹھائے ہزاروں لاکھوں ان پڑھ ہوں گے جو گلیوں میں بے روزگار پھر رہے ہوں گے اور ان کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں ہوگا۔

سرکاری یونیورسٹیوں کے ہر طرف پھیلتے سب کیمپس اور پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تحت کھولے گئے سرمایہ دارانہ ذہنیت کے حامل اعلیٰ تعلیم کے ادارے محض پیسے کمانے کی خاطر اعلیٰ تعلیم کا جو کباڑہ کر رہے ہیں اور جس طرح تعلیمی اصول و ضوابط کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں ان کا فیصلہ سازوں کو کوئی احساس نہیں ہے۔ اب بعض جنرل یونیورسٹیوں نے بھی فاصلاتی تعلیم (Distance Education) کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ پہلے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہی قابو نہیں آ رہی تھی کہ اب بعض دیگر جامعات بھی اس کاروبار میں لگ گئی ہیں۔ کوالٹی ایشرنس (Quality Assurance) کے شعبے بھی موجود ہیں۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن بھی اپنی سی کوشش کرتا ہے لیکن زرداروں کی سینہ زوری کے سامنے بند باندھنا کسی کوالٹی ایشرنس کے ذمہ دار کے بس کی بات نہیں ہے۔

اچھے وقتوں میں تعلیمی اداروں میں مقابلہ معیارِ تعلیم، کھیلوں اور دیگر ہم نصابی سرگرمیوں کے انعقاد میں ہوتا تھا اور اب مقابلہ فیسیں لے کر علم حاصل کرنے کی تکلیف نہ دینے میں ہوتا ہے تاکہ ہمارے مستقبل کے سکالرز قلب و ذہن کو زحمت دے بغیر آسانی کے ساتھ ڈگریاں حاصل کر لیں۔

ہائیر ایجوکیشن آف پاکستان نے ایم فل میں تحقیقی مقالے کی شرط ختم کر کے ایک اور ظلم ڈھایا ہے۔ پہلے بھی کوئی معیاری تحقیق نہیں ہو رہی تھی لیکن کچھ روک ٹوک تو تھی لیکن اب تو وہ آلہ ہی توڑ دیا گیا ہے جس سے کوالٹی ایشرنس کا تھوڑا سا بھرم قائم تھا۔ اس قوم میں تحقیقی کلچر پیدا کرنے کی ضرورت ہے لہذا ایم فل یا ایم ایس کی سطح پر تحقیقی مقالہ (Research Thesis) لازمی ہونا چاہیے۔ ہائیر ایجوکیشن کے مختلف شعبوں میں ایکریڈیشن کونسلز تو بہت قائم ہو گئی ہیں لیکن بد قسمتی سے معیار دن بدن روبہ زوال ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ میں محنت اور دیانت کی ایک تحریک برپا کی جائے۔ استاد کی شخصیت ہی وہ چیز ہے جو معیارِ تعلیم کی ضمانت دے سکتی ہے۔

## عدم نفاذِ اردو کیا ہم استعمار کی کالونی ہیں؟

نفاذِ اردو کے حوالے سے سپریم کورٹ آف پاکستان میں زیر بحث معاملے میں فاضل عدالت نے ریمارکس دیئے ہوئے کہا کہ آخر پتہ تو چلے کہ کون نفاذِ اردو سے متعلق آئینی شقوں پر عمل درآمد میں رکاوٹ ہے؟ فاضل جج نے کہا کہ کیا ہم استعمار کی کالونی ہیں کہ اپنی زبان کو اہمیت دینے کی بجائے کسی دوسری زبان کو اپنائیں۔ انہوں نے ڈپٹی ایٹارنی جنرل سے کہا کہ وہ ان لوگوں کے ناموں کی ایک فہرست اگلی پیشی پر عدالت میں پیش کریں جو پچھلے ۲۷ سال سے آئین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور اردو کے نفاذ پر تیار نہیں۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ عدالت عظمیٰ نے ہر پاکستانی کے دل کی بات کہی ہے اور جو لوگ مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب ہو کر اپنی زبان کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انگریزی یا کوئی دوسری بین الاقوامی زبان سیکھ کر ملک اور معاشرے کو ترقی کی راہ پر ڈالا جاسکتا ہے، وہ جنت الحقاء میں بستے ہیں۔ خصوصاً پنجاب کے وزیر اعلیٰ جو گوری چڑی والے مشیروں کے کہنے میں آ کر اہل پنجاب کو زبردستی انگلش میڈیم کی طرف دھکیل رہے ہیں اور سکول سطح پر بھی مخلوط تعلیم کو عام کر کے بیرونی قوتوں کا ایجنڈا پورا کر رہے ہیں، وہ نفاذِ اردو کے حوالے سے آئین پاکستان کے ایک بڑے ڈیفالٹر ہیں۔ ہم عدالت عظمیٰ سے درخواست کریں گے کہ وہ اردو کو اس کا جائز حق دلائے اور نفاذِ اردو کے لیے واضح حکم جاری کرے بلکہ آئین سے کھیلنے والوں کو سزا دے تاکہ آئندہ کسی کو آئین سے کھلواڑ کی ہمت نہ ہو۔

اردو کی بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا، اسے دفتری زبان بنانا اور اسے مقابلے کے امتحان کی زبان رکھنے پر اصرار کرنا نہ صرف اردو کی حق تلفی ہے اور آئین پاکستان کی کھلی خلاف ورزی ہے بلکہ ایک اسلامی معاشرے اور ملک میں مغربی تہذیب کی بالادستی کی سازش بھی ہے جس کے مہروں کو سامنے لا کر کڑی سزائیں دی جانی چاہئیں۔

دریں اثناء تحریک نفاذِ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد شریف نظامی صاحب نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ پنجاب حکومت نے رواں سال سے پہلی اور دوسری جماعت میں اردو میڈیم کی اجازت دے دی ہے۔ لہذا اب حکومتی سکولوں اور تمام محب وطن اور اسلام پسند پرائیویٹ سکولوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ انگلش میڈیم کو دھتکار دیں اور اردو میڈیم کو بسروچشم قبول کریں تاکہ غلبہ انگریزی کے ذریعے غلبہ تہذیب فرنگ کی سازش کو ناکام بنایا جاسکے۔

## قومی زبان اردو کا نفاذ ضروری ہے

کیونکہ:

☆ تمام صوبوں کے درمیان اور بعض علاقوں میں صوبوں کے اندر بھی رابطہ کی فطری زبان اردو کے سوا کوئی اور نہیں۔

☆ بانیان پاکستان (علامہ اقبال، قائد اعظم، خواجہ ناظم الدین وغیرہ) نے قبل از آزادی اور اس کے بعد بھی اردو کو قومی زبان قرار دیا۔

☆ ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کی دفعہ ۲۵۱ کے مطابق اردو ہماری قومی زبان ہے۔

☆ نمایاں دانشوروں، ماہرین تعلیم اور محققین مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، عبدالسلام خورشید اور چوہدری احمد خان (علیگ) نے اردو کے مکمل نفاذ کے لیے عمر بھر جدوجہد کی۔

☆ قومی زبان میں تعلیم دینا پیغمبروں کی سنت ہے: ”ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس نے اپنی قوم کی زبان میں ہی پیغام دیا تا کہ وہ اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے“ (سورۃ ابراہیم آیت ۴)

☆ ہر زبان ایک مخصوص تہذیب اور ثقافت کی نمائندہ ہوتی ہے اور سیکھنے والوں پر اپنے اثرات چھوڑتی ہے۔

☆ تعلیم کے میدان میں ہر سال لاتعداد طلباء انگریزی کے لازمی مضمون ہونے کے سبب ناکامی کا منہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

☆ مقابلہ کے امتحانات انگریزی میں ہونے کی وجہ سے متوسط طبقہ کے اکثر ذہین نوجوان اعلیٰ انتظامی ملازمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

☆ غیروں کی زبان کا تسلط غلامی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

☆ طلباء کے نوخیز ذہنوں کو ایک مشکل اور نامانوس زبان بطور ذریعہ تعلیم سے نجات دلانا ضروری ہے۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ

☆ صوبہ پنجاب میں سرکاری سکولوں میں حالیہ نافذ کردہ انگلش میڈیم کو فوراً ختم کیا جائے اور ہر سطح

- پر تعلیمی زبان اردو ہو۔ اسی طرح ملک کے دیگر صوبوں میں بھی اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کیا جائے۔
- ☆ سو فیصد خواندگی کی شرح کے حصول کی خاطر انگریزی کو اختیاری مضمون قرار دیا جائے۔ اس طرح انگریزی کے تسلط سے قوم کو نجات مل جائے گی۔
- ☆ مقابلے کے تمام امتحانات اردو میں لیے جائیں۔
- ☆ اردو کو عدالتوں، دفاتروں اور دیگر کارسروکار میں نافذ کیا جائے۔
- ☆ علاقائی زبانوں (پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی اور بلتی وغیرہ) کو ۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ (۳) میں دیئے گئے طریقہ کار کے مطابق فروغ دیا جائے۔
- ☆ غیر ملکی زبان میں ٹیکنالوجی کو قومی زبان میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ قائم کیے جائیں۔

## انگریزی کی غلامی کیوں؟

- ہم انگریزی پڑھ نہیں رہے بلکہ اس کی غلامی کر رہے ہیں۔ کیسے؟
- ☆ قومی زبان ایف اے تک لازمی اور انگریزی بی اے تک
- ☆ اکثر ڈرائیوران پڑھ لیکن لائسنس اور سڑکوں پر سائن بورڈ انگریزی میں
- ☆ عوام کی اکثریت ناخواندہ لیکن عدالتی اور دفتری کارروائی انگریزی میں
- ☆ مقابلے کے تمام امتحانات اردو کی بجائے غیر ملکی آقاؤں کی زبان انگریزی میں
- لہذا اس غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے
- ☆ اردو بولو      اردو پڑھو      اردو لکھو
- ☆ اردو کو ذریعہ تعلیم بناؤ
- ☆ اردو کو پاکستان کی دفتری زبان بناؤ۔

## کیونکہ

اردو پاک و ہند میں اسلامی ورثے کی امین اور ہماری قومی زبان ہے اور یہی آئین پاکستان کا تقاضا ہے۔

جب کہ آج یہ عالمی سامراجی اداروں کے حملوں کی زد میں ہے جنہوں نے پاکستانی حکمرانوں کو اپنا آلہ کار بنا رکھا ہے۔ آئیے! انگریزی کی غلامی سے نجات اور اردو کے تحفظ، فروغ اور نفاذ کے لیے ہم سب مل کر جدوجہد کریں۔

## اسلام اور تصور انسان

آج ہم تصور انسان پر کچھ گفتگو کریں گے کیونکہ یہ تصور ماضی کے مقابلے میں آج زیادہ پیچیدہ اور غیر واضح ہے۔ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر آج تک دانشوروں، سائنسدانوں اور مفکرین نے انسان کے تصور پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن غموض فزوں تر ہی ہوا ہے۔ اس ضمن میں میرا بنیادی موقف یہ ہے کہ آج کا انسان کئی طرح کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور جب تک وہ ان زنجیروں سے آزاد نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ خود کو صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم یہ طے کریں کہ یہ زنجیریں کون سی ہیں اور انسان ان سے کیسے آزاد ہو سکتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم انسان کی تعریف کر لیں کہ انسان کہتے کسے ہیں!

قرآن حکیم اس ضمن میں دو الفاظ استعمال کرتا ہے ایک بشر اور دوسرا انسان۔ سورہ مریم آیت ۱۱۰ میں ہے ”قل انما انا بشر مثلكم“ (اے نبی کہو کہ میں تو ایک بشر ہوں تم ہی جیسا) اور سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۱ میں ہے ”وكان الانسان عجولا“ (انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے)۔ بشر سے قرآن کی مراد دو ٹانگوں کی وہ مخلوق ہے جو طویل ارتقاء کے بعد اب چھار ب کی تعداد میں زمین پر پائی جاتی ہے جب کہ انسان وہ پیچیدہ اور غیر معمولی وجود ہے جس کے اوصاف کسی اور مخلوق میں نہیں پائے جاتے۔ یہ انسان شاعری، فلسفے اور مذہب میں زیر بحث آتا ہے جب کہ بشر محض علم حیاتیات (Biology) کا موضوع ہے۔ بشر ایسی نفسیاتی، جسمانی اور حیاتیاتی خصوصیات رکھتا ہے جو انسانوں میں مشترک ہیں خواہ وہ گورے ہوں یا کالے یا پیلے۔ مغربی ہوں (یا مشرقی)، مذہبی ہوں یا غیر مذہبی اور ان طبعی قوانین کے مطابق زندگی گزارتا ہے جو آج تک مختلف سائنسی علوم نے دریافت کیے ہیں جب کہ انسان وہ ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں انسانیت کے بعض خصائص کے حامل ہوتے ہیں۔ گویا ہم سب بشر تو ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سب انسان بھی ہوں یعنی بشر ہونا تو سب انسانوں کا مشترک وصف ہے لیکن انسان ہونا امر دیگر ہے۔ بشر انسان ہو سکتے ہیں اور بعض ایسے بھی جو انسان بننے کے مختلف مراحل سے گزر رہے ہوں۔

☆ ایران کے معروف دانشور اور فلسفی جو انقلاب ایران سے قبل وفات پا گئے تھے۔ ان کا یہ لیکچر Humaunty and Islam کے عنوان سے چارلس کرزمن (Charles Curzman) نے لبرل اسلام (Loboral Islam) کے عنوان سے اپنے مجموعہ مضامین میں شامل کیا ہے۔

اس لحاظ سے دوسری تمام مخلوقات کی طرح 'بشر' ایک جسم نامی یا وجود (Being) ہے جب کہ 'انسان' بننا پڑتا ہے (Becoming)۔ انسان اس لحاظ سے دوسری تمام مخلوقات حیوانوں، درختوں اور بشر وغیرہ سے مختلف ہوتا ہے کہ انسان بننا پڑتا ہے جب کہ یہ تمام مخلوقات بنی بنائی ہوتی ہیں۔ دیمیک کے سفید کپڑے کی مثال لیجیے وہ جس طرح کے گھروندے بناتے ہیں وہ لاکھوں سالوں سے ایسے ہی گھروندے بناتے چلے آ رہے ہیں اور آئندہ بھی ایسے ہی بناتے رہیں گے۔ یہی حال بشر اور دوسری مخلوقات کا ہے۔ ایک سائنس فکشن میں مصنف نے ایک سائنسدان کی زبانی اس بشر کا حال لکھا ہے وہ کہتا ہے:

زمین سے ایک سائنسدان مریخ کی سیر کو گیا وہ مریخ کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا کہ اسے ایک مقامی یونیورسٹی میں ایک کانفرنس کے بارے میں پتہ چلا جس میں ایک مریخی سائنسدان نے، جو زمین سے ہو کر آیا تھا، وہاں کے آنکھوں دیکھے حالات بیان کرنے تھے۔ مصنف کہتا ہے کہ وہ سائنسدان روسٹرم پر گیا اور اس نے کہنا شروع کیا:

”زمین پر زندگی پائی جاتی ہے۔ منجملہ دوسری مخلوق کے وہاں بشر پایا جاتا ہے۔ اس بشر کی شکل و شباہت میں کیسے واضح کروں کیوں کہ آپ کے ذہن میں اس کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یوں سمجھیے کہ جیسے ایک بھیڑ تھیلے میں بند ہو جس میں دو سوراخ ہوں۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور دو پاؤں ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر بھرپور سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ بشر ایک دوسرے کو قتل کرنے میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے بہت سے گروپ جو جدید اسلحے سے لیس ہوتے ہیں، اپنے گھر بار اور دفاتر چھوڑ کر دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے گروپوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں حالانکہ بظاہر ان کا ان دوسرے لوگوں سے دشمنی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ شروع میں میرا خیال یہ تھا کہ یہ قتل و غارت گری حصول خوراک کے لیے ہے لیکن پھر میں نے دیکھا کہ ایک گروہ نے دوسرے کو قتل کیا اور بغیر کسی چھینا چھٹی کے چلا گیا۔ بشر میں خودکشی کا رجحان بھی پایا جاتا ہے تاہم ان کی زیادہ قوت ایک دوسرے کو بلا وجہ قتل کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے گوشت اور خون کی ضرورت بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ خوراک دوسرے ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو بے رحمی سے قتل کرنے کے بعد وہ فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنے ہیروز کے گن گاتے ہیں۔ خوراک کے حصول کے لیے بشر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ استعمال کرتا ہے۔ خوشبودار اور مزیدار پھلوں (اور سبز یوں) کو کھانے کی بجائے وہ گھر لے جاتا ہے اور آگ پر پکا کر اور تل کر کھاتا ہے۔ نتیجتاً وہ بیمار ہو جاتا ہے اور معدے کی اصلاح کے لیے



اسے ڈاکٹروں کی مدد لینا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پہ ڈاکٹر بہت امیر ہوتے ہیں اور معزز بھی گردانے جاتے ہیں۔ اگرچہ بشر کو زمین پر غلبہ حاصل ہے تاہم اس میں ایسی ہیمنیت پائی جاتی ہے جو زمین کے کسی اور جانور میں نہیں پائی جاتی۔“

سطور بالا میں بشر کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ شرمناک ہونے کے باوجود بڑی حد تک صحیح ہے۔ اگر ہم انسانی تاریخ..... میرا مطلب ہے انسانی حماقتوں کی تاریخ..... کا مطالعہ کریں تو وہ اس سے زیادہ طویل اور دلچسپ ہے جتنی انسانی مثبت حاصلات کی تاریخ۔ بشر وہ بندر (حیوان) ہے جس میں صدیوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کی خوراک، لباس اور ہتھیار ضرور بدلے ہیں لیکن اس کے خصائص وہی پرانے ہیں۔ جنگلی قبائل کے سردار چنگیز خاں (منگول فاتح ۱۱۶۲-۱۲۲۷ء)، ماضی کے ’مہذب‘ معاشروں کے عالی مرتبت شہنشاہوں اور آج کی ’مہذب‘ دنیا کے ’معزز‘ حکمرانوں کے مابین کوئی خاص فرق نہیں سوائے اس کہ چنگیز خاں نے سیدھے سبھاؤ یہ کہہ دیا تھا کہ میں قتل کرنے آیا ہوں جب کہ آج کی ’مہذب‘ دنیا کے حکمران [جھوٹ اور منافقت سے کام لے کر] یہ کہتے ہیں کہ ان کے پیش نظر تو امن کا قیام ہے۔ گو یا صرف پیرایہ اظہار بدلا ہے ورنہ جھوٹ، عدم مساوات، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری تو پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ یہ ہے بشر۔

تاہم انسان کچھ آئیڈیلز رکھتا ہے اور بعض خوبیاں وہ اپنانا چاہتا ہے جو بشر میں نہیں پائی جاتیں۔ بشر سے انسان بننے کا یہ سفر لامتناہی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

قرآنی آیت ایک پورا معاشرتی فلسفہ رکھتی ہے۔ اگرچہ صوفیاء وصول الی اللہ میں یقین رکھتے ہیں لیکن آیت میں لفظ الیہ (اس کی طرف) استعمال ہوا ہے نہ کہ فیہ (اس میں) گو منصور حلاج (۸۵۷-۹۲۲ء) واصل بحق ہونے کا مدعی تھا جس کا مطلب یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ذات باری مقید بمکان ہے جب کہ حقیقتاً وہ ذات غیر فانی، ازلی اور ماورائے زمان و مکان ہے۔ یہی چیز انسان کے اللہ کی طرف سفر کو لامتناہی بناتی ہے اور اسی سے بشر کے انسان بننے کی بات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

انسان میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں: ۱- شعور ذات ۲- چو اُس یعنی انتخاب و اختیار کی صلاحیت اور ۳- تخلیق کی قوت۔ انسان کی باقی ساری خصوصیات کا منبع بھی تین اوصاف ہیں اور ہم اتنے ہی انسان ہوتے ہیں جتنی ہم میں یہ تینوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اب جب ہمیں انسان کی بنیادی خصوصیات کا پتہ چل گیا تو ہم ان عوامل کا پتہ چلا سکتے ہیں جو ان اوصاف کے حصول کی راہ میں حائل ہیں اور ان رکاوٹوں کو دور کر کے ہم انسان بننے کے جہلی سفر کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ڈیکارٹ (فرانسیسی فلسفی ۱۵۹۶-۱۶۵۰ء) نے کہا تھا میں چونکہ سوچ سکتا ہوں اس لیے میں ہوں گویا اس نے ہر چیز پر شبہ کیا سوائے اپنے موجود ہونے کے۔ اس نے اپنے سارے فلسفے کی بنیاد اسی تشکیک پر رکھی۔ فرانسیسی دانشور آندرے گائیڈ (۱۸۶۹-۱۹۵۱ء) نے بھی اسی طرح کی بات کہی۔ اس نے کہا میں چونکہ محسوس کر سکتا ہوں لہذا میں موجود ہوں اور ایک تیسرے فرانسیسی مفکر البرٹ کیوس (۱۹۱۳-۱۹۶۰ء) نے کہا کہ میں بغاوت کر سکتا ہوں اس لیے میں ہوں۔ یہ تینوں بیانات صحیح ہیں لیکن کیوس نے جو بات کہی ہے وہ زیر بحث موضوع کے حوالے سے اہم تر ہے۔

جب تک آدم جنت میں تھا اور اس نے گناہ نہیں کیا تھا وہ ایک فرشتے کی طرح جنت میں رہتا تھا۔ جوں ہی اس نے گناہ کیا اور حکومت، وسعت نظری اور بغاوت کا پھل کھایا اسے جنت سے باہر پھینک دیا گیا تا کہ وہ زمین میں اپنے بل بوتے پر زندگی گزارنے کی جدوجہد کرے۔ جس طرح والدین بچوں کے بڑا ہونے پر انہیں گھر سے نکال باہر کرتے ہیں تا کہ بقول جین پال سارتر (فرانسیسی فلسفی ۱۹۰۵-۱۹۸۰ء) وہ اپنی زندگی کا بوجھ خود اٹھائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیوانات کے برعکس، جو اپنی جبلت کے زیر اثر کام کرتے ہیں اور کوئی قوت انتخاب و اختیار نہیں رکھتے، انسان کو اپنی زندگی کا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ پس یہ انسان ہے جو شعور رکھتا ہے اور اس بناء پر جنت بلکہ خدا کے خلاف بغاوت کر سکتا ہے یا اپنے اختیار کے استعمال سے اور اپنی مرضی سے خدا کی عبادت و پرستش کر کے مستحق نجات بن سکتا ہے۔ جو انسان بغیر کسی نیت اور ارادے کے اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ اس حیوان کی طرح ہے جو بے بس ہے اور انتخاب کا شعور نہیں رکھتا۔ گویا اطاعت اس شخص کی مطلوب ہے جو گناہ کر چکا ہو اور انسان کائنات کی واحد مخلوق ہے (۱) جو انتخاب کی اہل ہے (اللہ کی اطاعت کا رویہ بھی انسان کی قوت انتخاب و اختیار ہی کا ایک مظہر ہے) کیوس کی 'بغاوت' کا یہی مطلب ہے خواہ وہ بغاوت کسی سماجی نظام کے خلاف ہو یا اپنی فطرت کے اور اس کے برعکس ڈیکارٹ اور گائیڈ کا یہ کہنا ہے کہ میں چونکہ سوچ سکتا ہوں اس لیے میں ہوں اور میں چونکہ محسوس کر سکتا ہوں اس لیے میں ہوں، محض اثبات وجود کے مظہر ہیں۔ اس وقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

- ۱- انسان اس کائنات کی واحد مخلوق ہے جو شعور رکھتی ہے۔ اس شعور کی تین سطحیں ہیں: ۱- شعور ذات، ۲- شعور کائنات، ۳- فرد اور کائنات کے تعلق کا شعور۔ بشر اتنا ہی انسان ہوتا ہے جتنا وہ ان تین باتوں کا شعور رکھتا ہے۔

۱- قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نئی جگہ فرمایا ہے کہ جن بھی اس امر میں انسانوں کے ساتھ شریک ہیں مثلاً سورۃ الرحمن میں (مترجم)

۲- انسان صاحب اختیار ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی واحد مخلوق ہے جو فطرت، سماجی نظام اور اپنی فطری، جسمانی اور نفسیاتی احتیاجات کے خلاف بھی بغاوت کر سکتا ہے۔ انسان ان چیزوں کا انتخاب کر سکتا ہے جو نہ فطرت نے اس پر مسلط کی ہیں اور نہ جن کے لیے اس کی طبعی ساخت موزوں ہے۔ یہ انسان کی عظمت کا ایک بڑا مظہر ہے جو اس کے علاوہ صرف خدا ہی کو سزاوار ہے۔ حیوانات تو مشینوں کی طرح ہیں جو محض اپنی جبلت کے تحت زندگی گزارتے ہیں جیسے ایک بھیڑ میں سال میں ایک دفعہ جنسی جبلت جاگتی ہے جو ایک جبری اور مشینی عمل کی طرح ہے جس میں بھیڑ کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور جب اس جنسی بھوک کی تسکین ہو جاتی ہے تو بھیڑ اس کو اگلے سال تک اس طرح بھول جاتی ہے جیسے یہ موجود ہی نہ ہو۔

یہ صرف انسان ہیں جو اپنی فطری احتیاجات کے خلاف بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی 'خود غرض' فطرت کے باوجود خود کشی کر سکتے ہیں اور اپنے جسم و جان کے تحفظ کی جبلت کے باوجود اپنی جان دوسروں پر نثار کر سکتے ہیں۔ وہ پرسکون اور ہموار زندگی کے فطری داعیات کے باوجود بغاوت اور گناہ کی زندگی بھی گزار سکتے ہیں اور اس کے برعکس پاکیزہ اور زاہدانہ زندگی بھی گزار سکتے ہیں۔ اس سب سے ظاہر ہے کہ انسان اختیار انتخاب رکھتا ہے۔

۳- انسان ایسی مخلوق ہیں جو چھوٹی سے لے کر بڑی اشیاء تخلیق کر سکتے ہیں اور یہ خصوصیت اس امر کی مظہر ہے کہ انسانی فطرت میں خدائی طاقت و دیعت کی گئی ہے۔ بعض لوگ انسان کو ایسا حیوان سمجھتے ہیں جو اوزار بنا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان اوزاروں سے بڑھ کر بھی بہت کچھ بنا سکتے ہیں۔

انسان کی تخلیقی صلاحیتیں اس وقت ابھر کر سامنے آتی ہیں جب اس کی ضروریات اور خواہشات اتنی بڑھ جائیں کہ ان کا حل کائنات میں موجود نہ ہو۔ جب تک انسان اس پر قانع رہیں جو کائنات میں ان کے لیے مہیا کیا گیا ہے اس وقت تک ان کی حیثیت اس حیوان کی سی ہوتی ہے جو فطرت پر انحصار رکھتے ہیں لیکن جب ان کی ضروریات اور خواہشات فطرت کی طاقت اور خلاقیت سے بڑھ جائیں تو تنہا فطرت ان کی تسکین نہیں کر سکتی۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں جرمن فلاسفر مارٹن ہائیڈیگر (۱۸۸۹-۱۹۷۶ء) کہتا ہے کہ یہاں پہنچ کر "انسان تنہائی محسوس کرتا ہے" وہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی اور دلیس کا باسی ہے، اس مادی زندگی سے ماورا ہے اور دوسرے جانداروں سے بہر حال کوئی الگ قسم کی مخلوق ہے اور ایسے آئیڈیلز سے اپنی طرف کھینچتے ہیں جو فطرت میں وجود نہیں رکھتے مثلاً وہ اڑنا چاہتا ہے لیکن فطرت نے اسے پر نہیں دیے چنانچہ اس نے ہوائی جہاز، سیٹلائٹ سٹیشن اور خلائی جہاز بنانے شروع کر دیے۔

ٹیکنالوجی ان انسانی کوششوں کی خلاقیت کی مظہر ہے جو وہ فطرت کے سرکش گھوڑے کو لگام دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کی مثال پٹرول کی ہے جو زیر زمین موجود ہوتا ہے لیکن انسان اپنے معمول کے ذرائع سے اس کے اخراج پر قادر نہیں۔ اس چینج کا جواب پٹرولیم انڈسٹری دیتی ہے جو زمین سے تیل نکالنے کی ٹیکنالوجی فراہم کرتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان تین خصوصیات رکھتے ہیں، شعور ذات و کائنات، صلاحیت انتخاب اور قوت تخلیق۔ یہ تینوں صفات دراصل خدا کی ہیں اور انسان ان میں محض خدا سے مماثلت رکھتا ہے۔ میں چونکہ شرک سے بچنا چاہتا ہوں اس لیے یہ نہیں کہتا کہ انسان اللہ کی طرح یہ صفات رکھتا ہے بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ انسان ایسی مخلوق ہے جو فطرت کے برعکس یہ خدائی صفات اپنے اندر رکھتی ہے اور مسلسل ترقی کرتی رہتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا قول مبارک کہ ”تخلقوا باخلاق اللہ“ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں اللہ جیسے اخلاق اپنانے چاہئیں۔ مطلب یہ کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے جب کہ بشر بندروں کا خلیفہ ہے اور انہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ صرف انسان ہے جو محدود شکل میں خدائی صفات اپنے اندر رکھتا ہے، مدرک شعور ہے اور صلاحیت انتخاب اور قوت بغاوت و تخلیق رکھتا ہے۔

اس وقت یہ حق انتخاب رکھنے والے انسان بہت سی پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ بہت سی قیدوں میں محبوس ہیں جو انہیں شعور ذات، حق انتخاب اور قوت تخلیق سے محروم کرتی ہیں۔ بد قسمتی سے اس وقت جو بدترین صورت حال انسانوں کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ مختلف نظریات اپنے منہج کے مطابق انسان کو جو شعور ذات بخشتے ہیں اور انسانی سوسائٹی کو ترقی اور ارتقاء کے جس راستے پر چلاتے ہیں اتنا ہی وہ انسان کو اس کی خودی سے محروم کرتے اور اس کی انسانیت کو گوشہٴ غفلت میں دھکیلتے ہیں۔ ایسے نظریات میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

#### ۱- مادہ پرستی (Materialism)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انسان مادے سے وجود میں آیا ہے اور مادی ارتقاء ہی سے موجودہ حالات تک پہنچا ہے۔ اگر ان کی رائے کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی مادی جکڑ بند یوں سے اوپر اٹھ ہی نہیں سکتا۔

#### ۲- فطرت پرستی (Naturalism)

نظریہ فطرت اٹھارویں صدی میں منصہٴ شہود پر آیا اور انیسویں صدی کی ابتداء تک خوب پھلا

پھولا۔ اس کے مطابق کائنات کی اصل فطرت ہے اور وہی انسان کی خالق ہے۔ پس انسان اگر آزاد ہے، صلاحیت انتخاب رکھتا ہے اور اپنے آپ کو محسوس کر سکتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت نے اسے ایسا ہی بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی پرواز درحقیقت محدود ہے اور اتنی ہی ہے جتنی فطرت نے اسے عنایت کی ہے۔

### ۳۔ نظریہ وجودیت (Existentialism)

اگرچہ سارتر، ہائیڈیگر اور کرکی گارڈ (ولندیزی فلاسفر ۱۸۱۳-۱۸۵۵ء) کا نظریہ وجودیت لاندہی ہے تاہم اس کے باوجود ان کا، خصوصاً سارتر کا، خیال یہ ہے کہ انسان دوسرے جانداروں سے مختلف مخلوق ہے۔ سارتر اگرچہ خدا اور مابعد الطبیعیات میں یقین نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ انسان دوسرے حیوانات سے مختلف اور متضاد ہے۔ دوسری مخلوق پہلے پیدا ہوئی اور انسان بعد میں۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ خدا نہیں ہے تو پھر ہمیں انسان کو اس مادی کائنات میں گھسیٹنا پڑتا ہے اور یوں ہم اسے ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ دیگر حیوانات اور انسانوں میں فرق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حیوانات میں جو ہر پہلے پیدا ہوا اور وجود بعد میں، جب کہ انسان کا وجود پہلے پیدا ہوا اور جو ہر بعد میں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اگر میں ایک بڑھئی سے پوچھوں کہ وہ کیا بنا رہا ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے کہ 'کرسی' اور جب میں اس سے پوچھوں کہ کرسی کیا ہوتی ہے؟ تو وہ جواب دے گا کہ اس کے چار پائے ہوتے ہیں، ایک سیٹ ہوتی ہے..... وغیرہ۔ یہ چیزیں کرسی کا جو ہر ہیں جب کہ کرسی ابھی وجود میں آئی ہی نہیں۔

لیکن انسان کرسی سے مختلف ہے۔ اس کے وجود کا ظہور تو پہلے ہو جاتا ہے لیکن وہ کون ہے اور کیا ہے؟ اس کا تعین ہونا ابھی باقی ہے اور اس کا انحصار انسانی فیصلے پر ہے۔ گویا نظریہ وجودیت کے علمبرداروں کا کہنا یہ ہے کہ انسان اپنے جوہر کا فیصلہ خود کرتے ہیں کہ انہوں نے اسے کیا شکل دینی ہے۔ اسی وجہ سے سارتر کہتا ہے کہ اگر انسان اپنے حق انتخاب کا استعمال نہیں کرتا تو وہ گویا انسان ہی نہیں ہے۔ اسی طرح سارتر اس خدشے کا اظہار بھی کرتا ہے، اور وہ اس میں حق بجانب ہے، کہ اگر ہم میٹرلیزم اور نیچرل ازم کو اساس تسلیم کر لیں، جیسا کہ ہم کیے ہوئے ہیں، تو یہ بھی انسان کے حق انتخاب کی آزادی کو مجروح اور متاثر کرنے والی بات ہے۔

### ۴۔ نظریہ ہمہ اوست (Pan Theism)

ہمہ اوست کا نظریہ مذہبی پس منظر کا حامل ہے اور بعض مسلم صوفیاء، ہندو اور کیتھولک عیسائی اس میں

یقین رکھتے ہیں یہ الہیاتی جبریت بھی انسانی حق انتخاب کو مجروح کرتی ہے۔ کیتھولک عیسائی اور مسلمان بھی کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو انسان کا حق انتخاب رکھنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی حوالے سے حافظ (مشہور فارسی شاعر ۱۳۳۵-۱۳۹۰ء) نے کہا تھا کہ منزل (تقدیر) کا تعین کرتے وقت چونکہ ہم موجود نہ تھے لہذا اگر ہم اس سے متفق نہ ہوں تو اسے کوئی بڑی بات نہ سمجھا جائے۔

شاعر دراصل یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ جب ہم تخلیق کیے جا رہے تھے تو اُس وقت ہماری رائے تو لی نہیں گئی بلکہ اللہ نے جیسا چاہا ہمیں بنا دیا۔ بعد میں اس نے ہمیں زمین پر آزاد چھوڑ دیا (تو ہماری ذمہ داری کیا ہے؟) ایک اور شاعر نے حافظ کی پیروڈی کرتے ہوئے کہا کہ اب اگر ہماری حرکتیں تمہیں بد مزہ کرتی ہیں تو اس میں ہمارا قصور آ خر کیا ہے؟<sup>(۱)</sup>

یہ ایک طرح کی جبریت ہے لہذا اس پر ہمارا اعتراض بے محل نہیں۔ تقریباً ایسا ہی اعتراض کیوس کا بھی تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تم کس کے خلاف احتجاج کر رہے ہو تو اس نے کہا 'خدا کے'۔ پوچھا گیا کیا تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا 'نہیں'۔ سوال کرنے والے نے کہا جب تم ایسی کسی ہستی پر یقین ہی نہیں رکھتے جو کائنات کا انتظام چلا رہی ہے تو تم احتجاج کس کے خلاف کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا 'احتجاج تو مجھے کرنا ہے اگر کوئی متعین ہستی ایسی نہیں ہے تو احتجاج تو میں پھر بھی کروں گا'۔

یہ ہوا میں کلمے لہرانے جیسی حرکت ہے کیونکہ اگر خدا فیصلے کرتے وقت اپنی مرضی کرتا ہے اور انسانی مرضی کا لحاظ نہیں کرتا تو یہ انسانی ذمہ داری کی نفی ہے اور اگر انسان ذمہ دار نہیں ہے تو وہ 'انسان' ہی نہیں ہے۔

## ۴- تاریخ (Historicism)

اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ انسان تاریخ کی پیداوار ہے جیسے میری شخصیت پر اسلام، شیعہ ازم اور ایران کے امنٹ اثرات ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں تاریخ میں اپنے حقیقی مقام کی بجائے فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں رہ رہا ہوتا

(۱) اردو ادب میں بھی اس طرح کی چیزیں موجود ہیں جیسے غالب نے کہا تھا کہ۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پناہ حق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا  
اور اقبال نے کہا ہے کہ۔ روز ازل مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

تو میری زبان، جذبات اور خصوصیات یقیناً مختلف ہوتے۔ کیا اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ انسانی خصائص تاریخ کے مہون منت ہوتے ہیں تو پھر میرے حق انتخاب کی کیا حقیقت رہ گئی؟ سوائے اس کے کہ جو تاریخ نے میرے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ اگر میں مسلمان ہوں اور فارسی بولتا ہوں تو یہ بھی ایک طرح سے تاریخ کا جبر ہے اور جس طرح فطرت طے کرتی ہے کہ میرے جسم کا رنگ کیا ہو، اسی طرح تاریخ یہ بھی طے کرتی ہے کہ میری فکر اور شخصیت کیسی ہو۔

#### ۵۔ سماجی نظام (Socialism)

اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ سماجی ماحول اور نظام انسان کی شخصیت گری کرتے ہیں۔ اگر میں بچی ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جاگیر دارانہ پس منظر رکھتا ہوں اور اگر میں بہادر ہوں تو اس کا سبب یہ ہے کہ میں قبائلی پس منظر کا حامل ہوں جس میں میں پلا بڑھا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا سماجی نظام جو انسانوں کے باہمی تعلقات، ذرائع پیداوار، حقوق ملکیت، انتظامی ڈھانچے وغیرہ سے مل کر بنتا ہے، اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق ہماری شخصیت کو تشکیل دیتا ہے اور فرد، بحیثیت انسان، اپنی مرضی نہیں کر سکتا کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں یا یہ بننا چاہتا ہوں۔

#### حیاتیاتی بالادستی (Biologism)

یہ مکتب فکر انسان کی تفہیم مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے ذرا بہتر انداز میں کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیسویں صدی کے سائنسدان سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تصور انسان کی مادہ پرست تفہیم سے اب مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس وہ انسان کے حیاتیاتی خصائص کو زیادہ اہم گردانتے ہیں تاہم اس کے باوجود وہ انسان کو باشعور اور آزاد ہستی اب بھی تسلیم نہیں کرتے۔ جب میں اپنے لاشعور اور حیاتیاتی قوتوں کا محکوم ہوں تو پھر میں، کہاں ہوں؟ ماہرین حیاتیات کہتے ہیں کہ مولے آدمی شفیق ہوتے ہیں اور دبلے لوگ ذہین ہوتے ہیں۔ پس جب میرے ذہین یا شفیق ہونے کا انحصار میری جسمانی ساخت پر ہے تو اس میں میری مرضی کا دخل کتنا ہے؟

میں فطرت، معاشرے اور تاریخ کے اثرات کا انکار نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ ان عوامل کے باوجود انسان کی صلاحیت انتخاب باقی رہتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ عوامل اور ماحول انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر کچھ لوگ پہاڑی قبائل کی صورت میں رہتے ہیں تو اس میں ان کے انتخاب کو دخل نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح اگر کچھ لوگ خانہ بدوشوں کی طرح خیموں میں رہتے ہیں اور ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوتے

رہتے ہیں تو یہ مخصوص سماجی اور معاشی حالات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ خصوصی فطری حالات کی وجہ سے جنگلوں میں رہتے اور شکار اور مچھلی پر گزارہ کرتے ہیں۔ دیہات کے لوگ اگر بڑے شہروں میں منتقل ہوں تو ان کے اخلاق و اقدار بدل جاتے ہیں۔ اس تبدیلی میں ان کی مرضی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ مخصوص معاشی حالات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان ویسا ہی بنتا ہے جیسے فطرت، تاریخ اور معاشرہ اسے بناتے ہیں اور اگر یہ عوامل تبدیل ہو جائیں تو انسان بھی تبدیل ہو جائے گا۔

اس سب کے باوجود میری رائے یہ ہے کہ انسان اپنے ارتقائی مراحل میں، اور خصوصاً بشر سے انسان بننے کے پروسس میں، جبر کے ان عوامل پر غالب آ جاتا ہے مثلاً جغرافیائی اثرات کی مثال لیجیے کہ انیسویں صدی تک لوگوں کے ذہنوں پر ان کا اتنا غلبہ تھا کہ تیئنی مورخ ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶ء) کی رائے یہ تھی کہ معاشرے جغرافیائی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں اور جغرافیائی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ یقیناً ابن خلدون نے جب یہ بات کہی تھی تو اُس وقت وہ صحیح تھا لیکن آج یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ معاشرہ جتنا ترقی کرتا جاتا ہے جغرافیائی جبر سے آزاد ہوتا جاتا ہے۔

انسان فطری بندشوں سے کیسے آزاد ہو سکتا ہے؟ یہ سمجھنا آج آسان ہے کیونکہ موجودہ صدی میں ہم نے خود کو فطری بندشوں سے آزاد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج انڈسٹری اور جدید تہذیب نے ماضی کے مقابلے میں، زیادہ بہتر انداز میں انسانوں کو فطری پابندیوں سے آزاد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج افریقی صحارا میں بھی لوگ انہی جدید سہولتوں کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں جن سہولتوں کے ساتھ لوگ شمالی امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ کشش ثقل بھی اس فطری جبر کی ایک مثال ہے۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ یہ گویا ہمارے جسم کے لیے ایک ناگزیر حقیقت ہے لیکن اب ہم اس سے نجات پاسکتے ہیں۔ اسی طرح اب ہم مقامی زرعی پیداوار تک بھی محدود نہیں رہے۔ ماضی میں لوگ وہاں رہتے تھے جہاں پانی ہو، دریا ہوں اور (نباتات و حیوانات کے لیے) جنگل ہوں اور ان کے بغیر زندگی ممکن نہ تھی لیکن آج لوگ صحرا میں رہ کر بھی جدید تمدنی سہولتوں کے ساتھ آرام سے زندگی گزار سکتے ہیں اور نئی تہذیب کو جنم دے سکتے ہیں۔

انسان ان بندشوں سے کیسے نجات پاسکتا ہے؟ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ فطرت کے جبر اور اس کے اصولوں اور خود پران کے اثرات کو سمجھ سکے۔ ان کا مطالعہ سائنس کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ سائنس کے ذریعے ہی انسان ٹیکنالوجی ایجاد کرتا ہے اور اس ٹیکنالوجی کا ایک ہی بنیادی مقصد ہے کہ وہ خود کو فطرت کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرا سکے۔ جو لوگ ٹیکنالوجی پر اس لحاظ سے تنقید کرتے ہیں کہ اس نے انسان کی ہیئت اور مزاج کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، ان کی بات بے وزن نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ



ٹیکنالوجی انسان کو (بہت سے نقصانات اور تباہی سے) بچا سکتی ہے مثلاً یہی دیکھیے کہ ماضی میں انسان کو خوراک اور لباس کے حصول کے لیے دن میں دس بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا اور یہ گویا تاریخ کا ایک جبر تھا لیکن ٹیکنالوجی کی وجہ سے پیداوار بڑھ گئی اور اب انسان کم وقت میں اور کم محنت سے ضرورت کی چیزیں حاصل کر سکتا ہے۔ اس پر اگر کوئی اعتراض کرے کہ آج بھی بعض لوگوں کو ماقبل ٹیکنالوجی دور سے بھی زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے تو اسے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بورژوا طبقہ اپنا صرف خرچ (Consumption) بڑھاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے پیداوار مزید بڑھانا پڑتی ہے۔

اب ہم فطرت کی بندشوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ زیر بحث لا کر آپ کو بتائیں گے کہ کس طرح سائنس و ٹیکنالوجی ہمیں ان سے نجات دلانے میں کردار ادا کر سکتی ہے مثلاً یہ دیکھیے کہ ہم تاریخ کے جبر سے سائنس کی مدد سے کیسے نجات پاسکتے ہیں؟ اگر ہمیں پتہ چل جائے کہ وہ کون سے اصول و ضوابط ہیں جو تاریخ کو کنٹرول کرتے ہیں اور وہ کیسے ہماری سوچ، خواہشات، جذبات اور اخلاق کو متاثر کرتے ہیں تو یقیناً ہم خود کو تاریخ کے جبر سے بچا سکتے ہیں۔ اس وقت ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ایسے کئی معاشرے موجود ہیں جنہوں نے ایک ہی جست میں وہ تاریخی مراحل عبور کر لیے ہیں جن سے معاشرے بالعموم یکے بعد دیگرے گزرتے ہیں۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ اگر کوئی معاشرہ مختلف تاریخی مراحل کے حقائق کا شعوری ادراک حاصل کر لے اور اس کے آزاد فکر دانشور ہر مرحلے کی ضروریات و مقتضیات کو سمجھ لیں تو ایسا معاشرہ یقیناً ہر مرحلے سے گزرے بغیر، ایک ہی جست میں کئی مراحل طے کر سکتا ہے۔ ہم نے عصر حاضر میں مشاہدہ کیا ہے کہ بعض قومیں جو غلام تھیں یا خانہ بدوش تھیں وہ تاریخ سے بغاوت کرتے ہوئے ایک ہی جست میں بورژوائی مرحلے میں داخل ہو گئی ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے ممکن ہوا کہ وہ تاریخی جبر سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تاریخی جبر کی نوعیت، اس کی حرکت و ارتقاء اور اس میں کار فرما اصول و ضوابط کو سمجھنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

اسی طرح سماجی جبر کو لیجیے۔ ماضی میں فرد کا ارتقاء معاشرتی تقاضوں کے مطابق ہوتا تھا لیکن آج فرد معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان تعلقات، سیاسی نظریات اور حکومتی معاملات کو جتنا سمجھتا چلا جاتا ہے اتنا ہی وہ ان کی بندشوں سے اوپر اُٹھتا جاتا ہے بلکہ جرمن فلسفی کارل جاسپر (۱۸۳۳-۱۹۶۹ء) کے الفاظ میں 'معاشرہ جن لوگوں کی تشکیل کرتا تھا۔ اب وہ معاشرے کی تشکیل نو کرتے ہیں' مثلاً ماضی میں خانہ بدوش، جاگیردارانہ معاشرے کے افراد اور پسماندہ دیہاتی اپنے مذہب، اقدار اور حکومت پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ ان کا صحیح ہونا بلکہ ان کا تقدس ان کے لیے اظہر من الشمس تھا۔ یہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ان سے ہٹ کر مختلف زندگی گزار سکتے ہیں یا ان کے خلاف بغاوت کر سکتے

ہیں لیکن آج کا انسان اپنی مرضی سے مذہب کا انتخاب کر سکتا ہے یا جس مذہب کو مانتا ہے اسے تبدیل کر سکتا ہے۔

**مذہب بھی ایک ایسا معاملہ ہے جسے معاشرہ فرد پر مسلط کر دیتا ہے** لیکن آج حالات بدل چکے ہیں۔ نظریات ملکیت، ذرائع پیداوار، معاشی نظام، سماجی و طبقاتی روابط، خاندانی حقوق و مراعات، اور سماجی گروپ بندی آج کے باشعور انسان کے لیے ماضی کی طرح ابدی، ناقابل تغیر اور وحی کی طرح مقدس نہیں رہی بلکہ انسان کے لیے ایسی چیز بن گئے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ سکتا ہے، ان میں انتخاب کر سکتا ہے، انہیں بدل سکتا اور بہتر بنا سکتا ہے اور چاہے تو انہیں رد بھی کر سکتا ہے۔ یہ تبدیلیاں اور اصلاحات بلکہ انقلابات اس بات کے گواہ ہیں کہ آج کا انسان تاریخ کے چنگل سے آزاد ہو چکا ہے۔ انسان کی یہ آزادی سماجی علوم اور سماجی نظاموں کے تقابلی مطالعے کی مرہون منت ہے۔ سائنس انسان کو ان عوامل کی قید سے مکمل نجات دلانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

**قید نفس:** سب سے آخری اور بدترین قید جس نے انسان کو مکمل بے بس بنا دیا ہے وہ قید نفس ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ساری انسانی تاریخ میں انسان مذکورہ بالا جکڑ بندیوں سے کبھی اتنی نجات نہیں پاسکا جتنی وہ آج پا چکا ہے لیکن اس کے باوجود کسی قید کے سلسلے میں وہ اتنا بے بس بھی کبھی نہیں ہوا جتنا اس آخری قید کے ہاتھوں وہ آج ہے۔ یہ ایسی قید ہے کہ جس کے آگے سابقہ قیدیں، بیچ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آج کا انسان جو بڑی حد تک فطرت، تاریخ اور معاشرے کے جبر سے آزاد ہو چکا ہے کیوں اس آخری قید کے حوالے سے بے بسی کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے؟

آج کا انسان اگرچہ ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ با علم اور با صلاحیت ہے لیکن اس کے باوجود وہ نہیں جانتا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ وہ کیوں اپنے نفس کے پنجرے سے آزاد نہیں ہو سکتا؟ ماضی میں انسان کو ان جکڑ بندیوں اور اپنی محدودیتوں کا اندازہ تھا چنانچہ کھانے پینے اور زندہ رہنے کے لیے ابتدائی دور کا انسان جنگل یا دریا کے کنارے رہتا تھا تا کہ پانی، مچھلی، جانوروں کا گوشت اور درختوں کے پھل اسے بآسانی میسر آسکیں لیکن نفس کی قید تو آدمی اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے۔ یہ مٹی کی دیوار کی طرح کی قید تو ہے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قید کا شعوری احساس کرنا اور اس سے مانوس ہونا مشکل ہے۔ یہاں قید اور قیدی اور مرض اور مریض دونوں ایک ہیں لہذا اس قید سے چھٹکارا محال ہے۔

ایک اور مشکل یہ ہے کہ آدمی سائنس کی مدد سے فطرت، تاریخ اور سماج کی جکڑ بندیوں سے نجات پاسکتا ہے لیکن سائنس کی مدد سے قید نفس سے نجات نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ سائنس بھی خود انسان کی مٹھی

میں ہے لہذا نفس محسوس نہیں کرتا کہ اس کے اندر ایک آزاد نفس، ذہن ہے۔ نفس یہ تو محسوس کرتا ہے کہ اسے تاریخ، فطرت اور سماج کی جکڑ بند یوں سے آزاد ہونا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اس آزادی کا مآل کیا ہے؟ یہاں میں چند عمومی اصول بیان کرنا چاہوں گا:

۱- ہر انسان کی کچھ ضروریات ہوتی ہیں۔

۲- وہ ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور راحت محسوس کرتا ہے۔

۳- اس راحت کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

۴- یہ ناکامی اسے بغاوت پر ابھارتی ہے۔

۵- بغاوت کا نتیجہ رہبانیت اور داخلیت و موضوعیت کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ اصول انسانی زندگی میں ازل سے کارفرما ہیں اور آج کے بھی، وجودی، ہماری ماضی کی اشراقیہ جو تصوف پر منتج ہوئی، ہندو چینی تہذیب کی سریت جو روان کی صورت میں مادی زندگی کی نفی کرتی ہے اور مادی زندگی کی حقارت کرتا نیا پورژوائی نظام..... یہ سب میرے مذکورہ بالا عمومی اصولوں کی سچائی کی تصدیق کرتے ہیں۔ انسان اپنے مادی آئیڈیلز کو بہت اہمیت دیتے ہیں جب تک وہ پورے نہ ہو جائیں لیکن جوں ہی وہ پورے ہو جائیں ان کی اہمیت اس کی نظر میں ختم ہو جاتی ہے اور ایک خالی پن اس پر سوار ہو جاتا ہے لہذا انسانی آئیڈیلز ایسے بلند ہونے چاہئیں جو اسے بندگی اور مایوسی تک نہ لے جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان اگر فطرت وغیرہ کی جکڑ بند یوں سے آزادی حاصل کر بھی لیں تو فاتح ہونے کے باوجود بے بس رہیں گے۔ اس بات کو فرانسسیسی دانشور جین زولٹ (Jean Zoulet) (۱۸۵۴-۱۹۲۹ء) نے یوں کہا تھا کہ ایک مصنف نے اپنی کہانی میں لکھا ہے کہ ایک شہزادہ تھا جس کے پاس دولت کی ریل پیل تھی لیکن اس کے باوجود وہ ایک ناقابل علاج داخلی مرض میں مبتلا تھا۔ آج کے فرانس کی حالت بالکل اس شہزادے جیسی ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ آج کے انسان کی حالت اس شہزادے جیسی ہے اور بہت کچھ ہونے کے باوجود وہ بے بس ہے۔

بالینڈ میں روٹڑیم کے معروف چوک میں ایک دلچسپ مجسمہ ہے جس کے اعضاء اپنی اپنی جگہ پر نہیں ہیں مثلاً اس کی گردن پہلو کی طرف ڈھکی ہوئی ہے، بازو اپنے جوڑوں سے اکھڑے ہوئے ہیں..... اور دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ مجسمہ ابھی گرنے والا ہے..... لیکن ظاہر ہے وہ پتھر کا بنا ہوا مضبوط مجسمہ ہے۔ دراصل مصور نے یہ مجسمہ دوسری جنگ عظیم کے بعد بنایا تھا اور اس میں اُس نے یہ دکھایا ہے کہ

آج کا انسان گرچہ بظاہر چٹان کی طرح مضبوط ہے لیکن اس کے باوجود وہ گر کر تباہ ہونے والا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ آج کا انسان ماضی کی جکڑ بند یوں سے آزاد ہو کر اتنا طاقتور ہو چکا ہے کہ مرتیٰ پر کمندیں ڈال رہا ہے اور فضاء کو مسخر کر رہا ہے تاہم ساتھ ہی وہ اتنا کمزور ہے کہ اگر تم اس کی تنخواہ میں ۱۲ ڈالر کا اضافہ کر دو تو وہ تمہارے ساتھ مل کر موجودہ مالک کے خلاف کام کرنے پر فوراً آمادہ ہو جائے گا۔

میں نے ایک دفعہ سنا تھا کہ افریقہ کے بعض علاقوں میں اب بھی غلامی کا رواج ہے۔ لوگ قدیم قبائلی لوگوں کو پکڑ لاتے ہیں اور کسی کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں، لیکن میں نے (متدن اور مہذب) مغرب میں غلامی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور کیمبرج اور سو بورن میں دنیا کے بہترین دماغوں کی نیلامی ہوتے دیکھی ہے۔ امریکہ، یورپ، روس ہر جگہ سے بڑے بڑے صنعت کار آتے ہیں اور ذہین طلبہ کو خرید کر لے جاتے ہیں۔ وہ ان کو پرکشش تنخواہ، کار، ڈرائیور، بگلہ کی پیشکش کرتے ہیں اور طلبہ مقابلتاً بہتر آپشن کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ غلامی ہی تو ہے۔ یہ کمپنیاں ان ذہین طلبہ کی مدد سے معاشرے کو فطرت اور تاریخ کے جبر سے تو بچا لیتی ہیں لیکن وہ خود اپنے نفس کے غلام ہوتے ہیں اور بے بس ہوتے ہیں کہ اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کر سکتے۔

جب آدمی سائنس کی مدد سے قید نفس سے آزاد نہیں ہو سکتا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آزادی کیسے حاصل کرے؟ اس کا جواب ہے محبت سے۔ لیکن محبت سے ہماری کیا مراد ہے؟ کیا صوفیوں والی محبت؟ جی نہیں! اس سے مراد ہے وہ الوہی قوت جو قلب انسانی کی گہرائی میں پائی جاتی ہے اور عقل و استدلال سے ماوراء ہے۔ صرف یہ نفس کی نظر نہ آنے والی دیواروں کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے اور نفس کے خلاف بغاوت کر سکتی ہے۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ کام انسان اپنی عقلی اور استدلالی قوت سے کیوں نہیں کر سکتا اور اس کے لیے قید نفس کی ان دیکھی دیواروں کو جذب دروں سے جلانا ہی اس کا واحد حل کیوں ہے؟ تو اس کے جواب میں میں اٹالوی دانشور اور ماہر سماجیات و لفریڈو پریٹو (Vilfredo Pareto) (۱۸۴۸-۱۹۲۳ء) کا یہ قول پیش کروں گا کہ انسانی اعمال تین طرح کے ہوتے ہیں:

۱- منطقی جیسے کھانا پینا، کام کرنا، مطالعہ کرنا، سوچنا..... وغیرہ

۲- خلاف منطق جیسے کریمز اور منچلے لوگوں کی حرکتیں اور

۳- غیر منطقی اعمال جو نہ منطقی ہوتے ہیں اور نہ خلاف منطق

منطقی اعمال وہ ہوتے ہیں جو کائنات کے سلسلہ علت و معلول سے مربوط ہوتے ہیں اور ہم

انہیں اپنی روزمرہ ضروریات کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن انسان بسا اوقات اپنے مادی وسائل اور خواہشات کو کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے قربان کر دیتا ہے خواہ اس کے بدلے میں اسے کچھ بھی نہ ملے جیسے معاشرے کے وسیع تر فائدے کے لیے۔ ایسے اعمال منطقی تو نہیں ہوتے بلکہ انہیں ایک لحاظ سے اخلاقی کہا جاسکتا ہے۔ تو محبت وہ جذبہ ہے جو انسان کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے یا اپنے اعلیٰ تر آئیڈیلز کے لیے اپنے دنیاوی نفع نقصان سے بالاتر ہو کر سوچے۔

میں اگر آپ سے جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی مارکیٹ میں مجھ سے غلط بیانی نہ کریں۔ یا میں اگر باؤنس ہو جانے والے چیک نہیں لکھتا تو اس لیے کہ مارکیٹ میں میری شہرت خراب نہ ہو جائے۔ اس طرح کی چیزیں عقل و منطق پر مبنی اور ایک طرح کی کاروباری اخلاقیات یا مفاداتی نیکیاں سمجھی جاسکتی ہیں۔ تاہم اگر میں ایسا ہیج بولتا ہوں جس سے میرا مادی نقصان ہوتا ہے یا جان چلے جانے کا خدشہ ہوتا ہے تو اس سے میرے اندر کا سویا ہوا انسان انگڑائی لے کر بیدار ہوتا ہے اور اس سے میرے وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے تو میرے اس فیصلے کا سبب عقل و استدلال نہیں بلکہ وہ یقین اور محبت ہوتی ہے جو میرے اندر سوئے ہوئے انسان کو جگا دیتی ہے۔

نطشے (۱۸۸۴-۱۹۰۰ء) ایک فرانسیسی فلسفی اور نابغہ عصر انسان تھا۔ اس نے جوانی کے غرور میں لکھا تھا کہ طاقت سچائی ہوتی ہے اور طاقتور ہی سچا ہوتا ہے اور یہ کہ دوسروں کی مدد کرنا کمزوری کی علامت ہے اور کمزوروں کو تاریخ بھلا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ لیکن عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس کے خیالات بھی بدلتے گئے اور پھر وہ میرا عقول واقعہ پیش آیا جو انسانی تاریخ میں مثبت ہو کر رہ گیا۔ ہوا یہ کہ وہ سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وزن کے بوجھ سے ریڑھی الٹ گئی ہے۔ کوچوان چابک مار مار کر گھوڑے کو کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور گھوڑا چابکوں کی مار سے اٹھنے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن ریڑھی کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ وہ اٹھ نہیں پاتا اور دوبارہ گر جاتا ہے۔ اس دوران اس کی ٹانگ بھی زخمی ہو گئی ہے لیکن کوچوان پر جنون سوار ہے اور وہ بے دردی سے گھوڑے کو مارے جارہا ہے۔ نطشے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میاں عقل کرو۔ پہلے ریڑھی سے وزن ہٹاؤ تو پھر ہی گھوڑا کھڑا ہو سکے گا لیکن کوچوان پر غصہ سوار تھا۔ اس نے نطشے کی بات نہ سنی اور پھر گھوڑے پر پھیل پڑا۔ نطشے نے اسے کالر سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا میاں! ہوش کی دوا کرو۔ کوچوان نے غصے میں زور سے بوڑھے کو دھکا دیا اور مارا۔ بوڑھا نطشے ان ضربات کو برداشت نہ کر سکا اور گھر پہنچنے تک اس کی روح قفسِ غصہ سے پرواز کر گئی۔

اس واقعے کو دو طرح سے دیکھا جاسکتا ہے: ایک یہ کہ نطشے ایک عظیم آدمی تھا جس نے ایک جانور کو

ظلم سے بچانے کی خاطر جان دے دی۔ دوسرے یہ کہ یہ ایک اجتماع حرکت تھی کہ ایک گھوڑا تو بچ گیا لیکن انسانیت ایک نابذ عصر دانشور سے محروم ہو گئی۔ نطشے کی یہ حرکت نہ تو منطقی ہے اور نہ خلاف منطق بلکہ یہ غیر منطقی ہے۔ یعنی منطقی تجزیے سے ماوراء ہے اور اس کا تعلق اخلاق اور محبت سے ہے۔ جب ہم کسی سے اس لیے محبت کریں کہ جواب میں وہ بھی ہم سے محبت کرے یا جب ہم کسی سے اس لیے حسن سلوک کریں کہ ہمیں اس سے کوئی کام ہو تو یہ تو کاروباری اخلاق ہے۔ حقیقی محبت وہ ہوتی ہے جب ہم کسی مقصد کے لیے سب کچھ قربان کر دیں اور بدلے میں کچھ بھی نہ چاہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی اعلیٰ تر آئیڈیل ہو جیسے اپنی جان بھی قربان کر دینا تا کہ کسی کی زندگی بچ جائے یا کچھ اعلیٰ تر مقاصد حاصل ہو جائیں۔

غیر منطقی یا ماورائے منطق مرحلے کے بعد ایک چوتھا مرحلہ آتا ہے اپنے آپ کو قربان کر دینے کا یعنی اثار کا اور یہ ایک ایسا تصور ہے کہ کسی اور زبان میں یہ لفظ ہی موجود نہیں۔ اثار کا مطلب ہے دوسروں کو خود پر ترجیح دینا یا دوسرے لفظوں میں اپنے آپ کو دوسروں پر قربان کر دینا۔ یعنی اگر دو آدمیوں کو جان دینا ہو تو انسان کا یہ فیصلہ کرنا کہ وہ خود جان دے گا تا کہ دوسرا بچ جائے۔ ظاہر ہے یہ جاننے کے باوجود کہ اس میں اُس کی زندگی اور اس کی خواہشوں، لذتوں، خوشیوں، مالی مفادات غرض ہر چیز کا خاتمہ ہے۔

پس سارے انسان اثار کی قوت سے نفس کی قید سے آزاد ہو سکتے اور اس کی نظر نہ آنے والی خوفناک چار دیواری کو گرا کر اس سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ منطق واستدلال سے ماوراء وہ محبت ہے جس میں انسان دوسروں کی خاطر یا کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے اپنی ذات کی نفی کرتا ہے اور اپنے نفس کے خلاف بغاوت کرتا ہے..... یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ایک آزاد انسان وجود میں آتا ہے اور جو ایک انسان کے لیے اعلیٰ ترین مقام ہے۔

خلاصہ یہ کہ آزاد پیدا ہونے والا، تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والا اور شعوری قوت سے خیر و شر میں انتخاب کی صلاحیت رکھنے والا انسان سائنس کی قوت سے فطرت اور تاریخ کے جبر سے خود کو نجات دلا سکتا ہے۔ وہ سماجی علوم کی ترقی سے سماج کی جکڑ بند یوں سے بھی خود کو بچا سکتا ہے لیکن قید نفس سے نجات پانے کے لیے اسے بقول رادھا کرشن (بھارتی فلسفی) (۱۸۸۸-۱۹۷۵ء) ”مذہب اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے“۔

ہم انسان دنیا میں ایک مشن اور ذمہ داری دے کر بھیجے گئے ہیں جس میں انسان، خدا اور محبت مل کر ایک نئے انسان کی تخلیق کرتے ہیں اور ایک نئے اور آزاد انسان کی تخلیق ہی اس زندگی میں انسان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

## ڈاکٹر علی شریعتی اور اسلام کا تصور انسان

۱- ہم نے ڈاکٹر علی شریعتی کا مضمون اسلام اور تصور انسان (Humanity and Islam) شوق سے پڑھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ پڑھ کر مایوسی ہوئی اور ہم نے ان کی فکر کو بھی، اس مضمون کی حد تک، مغرب گزیدہ پایا اور ہم نے محسوس کیا کہ چارلس کرزمن (Charles Curzman) نے اپنی تالیف "Liberal Islam" میں دیگر لبرل اسلامسٹوں یعنی مغرب سے مرعوب و متاثر دانشوروں کے مضامین کے ساتھ اگر اسے بھی شامل کیا ہے تو ٹھیک ہی کیا ہے کیونکہ اپنے اس لیکچر میں ڈاکٹر شریعتی اسلام کا صحیح تصور انسان پیش نہیں کر سکے بلکہ وہ مغربی لبرلزم سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور اسی پس منظر میں انہوں نے اسلام کے تصور انسان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲- ڈاکٹر علی شریعتی کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کا انسان کئی طرح کی جکڑ بندیوں میں محبوس ہے (بشمول مذہب اور اہل مذہب کی جکڑ بندی کے) اور اس کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان جکڑ بندیوں سے آزاد کرالے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ اس آزادی کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خود غرضی میں مبتلا ہو کر بندہ نفس بن جائے یا مادہ پرستی اختیار کر لے بلکہ دوسروں سے محبت اور ان کی خاطر ایثار ہی اسے حقیقی خوشی دے سکتا ہے اور اسے اعلیٰ درجے کا انسان بنا سکتا ہے۔

۳- ڈاکٹر شریعتی اپنے لیکچر کے آخر میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس میں جزوی سچائی موجود ہے یعنی جو انہوں نے کہا ہے وہ غلط نہیں ہے لیکن انہوں نے پورے سچ کا اظہار نہیں کیا اور نہ غلط کا پوری طرح رد کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے پورے سوال کا سامنا نہیں کیا بلکہ پہلو بچا کر نکل گئے۔

۴- اسلام کا تصور انسان یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا (۱) اور اسے شعور اور انتخاب (Choice) کی آزادی دی کہ چاہے تو وہ اپنے رب کو مانے اور اپنی زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزارے یا چاہے تو اپنے رب کو نہ مانے اور زندگی اپنی آزاد مرضی سے جیسے چاہے گزارے۔ انتخاب کی اس آزادی کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے (۲) اور اس میں اچھے اور برے دونوں طرح کے رجحانات رکھ دیے ہیں (۳) اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ کس

روحان کو اپنا تا اور اس کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہ بھی فرمایا کہ ہم نے موت اور زندگی کا یہ سلسلہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ دیکھیں کہ کون اچھے اعمال بجالاتا ہے <sup>(۱)</sup>۔ اور اس بات کو نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا کہ ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی سفید سلیٹ کی مانند کہ اس پر کچھ لکھا نہیں ہوتا اور اس پر کچھ بھی لکھا جاسکتا ہے) پھر یہ اس کے ماں باپ (اور ماحول) ہے جو اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتا ہے <sup>(۲)</sup> (یعنی وہ توحید چھوڑ کر غلط راستے پر چل پڑتا ہے)۔ اللہ نے انسان کے ساتھ کائنات کو بھی پیدا کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اللہ نے کائنات کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے <sup>(۳)</sup>۔ اس نے انسان کو کائنات کا علم دیا ہے <sup>(۴)</sup> اور اسے اس کائنات سے عبرت حاصل کرنے کے ساتھ <sup>(۵)</sup> اس کے برتنے، استعمال کرنے اور اس کی تسخیر پر اسے ابھارا ہے <sup>(۶)</sup>۔

۵۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار و انتخاب کی یہ آزادی دے کر اسے شتر بے مہار کی طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ جاؤ جو چاہے کرتے پھرو بلکہ:

i۔ اس کے اختیار کے صحیح اور غلط اور اچھے اور برے استعمال کے نتائج سے اسے باخبر کیا ہے اور اسے بتایا ہے کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے، تمہاری فطرت کے مطابق یہی ہے، کائنات سے ہم آہنگ ہو کر زندگی گزارنے کا تقاضا یہی ہے، عقل کا صحیح استعمال یہی ہے اور درحقیقت اللہ نے تمہیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ تم اس کی عبادت و بندگی (پرستش و اطاعت) کا راستہ اختیار کرو <sup>(۷)</sup> اور اللہ کی بندگی کو چھوڑ کر اپنی مرضی سے زندگی گزارے کا غلط فیصلہ نہ کرو <sup>(۸)</sup>۔ اور اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اول الذکر فیصلے کا نتیجہ ہے دنیا اور آخرت کی بھلائی <sup>(۹)</sup> اور اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے <sup>(۱۰)</sup> اور ثانی الذکر کے نتیجے میں دنیا میں تنگی ترشی کے ساتھ <sup>(۱۱)</sup> مشروط طور پر کچھ کامیابی اور آسائشیں بھی مل سکتی ہیں <sup>(۱۲)</sup> لیکن آخرت میں بہر حال اللہ کی ناراضی اور جہنم کے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا <sup>(۱۳)</sup>۔

یہاں ایک لطیف نکتہ ہے ان لوگوں کے لیے جو عربی جانتے ہیں (کہ اللہ نے اپنا آخری پیغام عربی زبان ہی میں نازل کیا ہے) کہ انسان کو خیر اور شر میں انتخاب کی آزادی کے لیے جو لفظ اختیار یا خیار

۱۔ ہود: ۱۱: ۷۱ - ۲۔ امام مالک، مؤطا، کتاب القرآن، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۹۸۵ء ۳۔ البقرہ: ۲۹

۴۔ البقرہ: ۳۱: ۲ - ۵۔ العنکبوت: ۲۹: ۲۰ - ۶۔ الاعراف: ۷: ۳۲

۷۔ الذاریات: ۵۱: ۵۶ - ۸۔ ص: ۳۸: ۲۶ - ۹۔ الاحزاب: ۳۳: ۷۱

۱۰۔ آل عمران: ۱۸۵ [۳] - ۱۱۔ طہ: ۲۰ [۱۲] - ۱۲۔ یونس: ۱۰: ۷۲

۱۳۔ الاعراف: ۷: ۱۷۳



عربی میں استعمال کیا جاتا ہے اس کا مادہ بھی خیر (خ ی ر) ہی ہے گویا اختیار کا مطلب ہی اختیارِ خیر ہے..... یا ہونا چاہیے، نہ کہ اختیارِ شر۔

ii- اللہ نے اختیارِ خیر کا بیج انسان کی سرشت میں اور آج کل کی اصطلاح میں انسان کی جین (gene) میں رکھ دیا ہے لہذا اللہ کا تصور ہر انسان کی فطرت میں built in موجود ہوتا ہے<sup>(۱)</sup> یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت، خواہ وہ پوری طرح اللہ کی مسلم نہ بھی ہو، اللہ کا تصور ضرور رکھتی ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی ایک تحقیق کے مطابق دنیا کے ۵.۷۷ فی صد انسان کسی نہ کسی صورت میں اللہ کا تصور رکھتے ہیں<sup>(۲)</sup>۔

iii- اللہ نے انسانوں کو انتخاب کی اس آزادی کے صحیح استعمال میں مدد دینے کے لیے ہر زمانے میں ہر قوم کے لیے پیغمبر اور نبی بھیجے کا اہتمام کیا<sup>(۳)</sup>۔ اللہ انسانوں ہی میں سے کسی ایک شخص کو چون لیتا ہے، اسے براہ راست ہدایت دیتا ہے اور پھر اس کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو صحیح راہ سے باخبر کرے<sup>(۴)</sup>۔

۶- گویا اللہ نے انسان کو باشعور بنایا ہے، اسے انتخاب کی آزادی دی ہے اور اسے کائنات کا علم دے کر اس کے استعمال اور اس کی تسخیر پر اسے ابھارا ہے۔ ان تین نکات تک تو ڈاکٹر شریعتی صاحب کی رسائی ہوگئی (انہیں قرآنی اصطلاح میں یوں کہا گیا ہے کہ انسان اللہ کا 'خلیفہ' ہے<sup>(۵)</sup>) لیکن اس کے بعد ڈاکٹر شریعتی کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ اللہ نے انسان کو اس کے انتخاب کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دینے کی خاطر اس کی رہنمائی بھی کی ہے اور صحیح انتخاب بتا بھی دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بشر صحیح معنوں میں انسان اس وقت بنے گا جب وہ اپنی آزادی مرضی سے اپنے حق انتخاب کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنی آزادی مرضی سے دست بردار ہو کر اللہ کی غلامی کو قبول کر لے گا، اس کی کبریائی کو تسلیم کر لے گا اور اس کے مقابلے میں اپنے کمزور و حقیر ہونے کو بلا شرط و حدود اور بلا چوں و چرا تسلیم کر لے گا۔ قرآن اسے یوں تعبیر کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو عبد پیدا کیا ہے 'وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون' <sup>(۶)</sup> گویا اسلام کا تصور انسان یہ ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے۔ انسان کا یہ رویہ کہ وہ اللہ کا عبد ہے، واحد صحیح رویہ ہے۔ انسان کا عبودیت کا یہ رویہ کیا ہے؟ قرآن و سنت نے اور علماء امت نے اس کی خوب وضاحت کر دی ہے۔

۲- انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا انٹرکبک ۱۹۹۸ء

۳- ابراہیم ۱۴: ۲۱۵

۶- الذاریات ۵۱: ۵۶

۱- الاعراف ۷: ۱۷۳

۳- الرعد ۱۳: ۷

۵- البقرہ ۳: ۳۰

تفصیلات سے قطع نظر اس میں دو اساسی تصور پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ پرستش کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور دوسرے یہ کہ اطاعت کی مستحق بھی صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔

اللہ کی عبودیت کا یہ تصور اسلام کہلاتا ہے<sup>(۱)</sup> جو لغوی لحاظ سے بھی صحیح ہے اور اصطلاحاً بھی۔ اور جو انسان اللہ کی عبودیت کا یہ تصور قبول کر لیتا ہے، قرآن اسے 'مسلم' کہتا ہے<sup>(۲)</sup>۔ اور جو اس کا انکار کرتا ہے اور اللہ کی مرضی کی بجائے اپنی آزاد مرضی سے زندگی گزارنا چاہتا ہے اور خود یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اور خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ اسے قرآن منکر حق یعنی کافر کہتا ہے<sup>(۳)</sup>۔

گویا انسان کے لیے واحد صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبد بن جائے اور مسلم یکسو بن جائے<sup>(۴)</sup>۔ یہی اس کی منزل ہے اور یہی اس کی معراج ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑا کوئی آدرش نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے بڑی کسی کامیابی کا تصور۔

۷۔ آج بشر کو انسان یعنی صحیح معنوں میں انسان بننے کے راستے میں جو رکاوٹیں اور جکڑ بندیاں حائل ہیں، ان میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ مغرب کی غالب فکر و تہذیب کے زیر اثر آج کے انسان نے غلط چوائس کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس نے اللہ کی کبریائی کو رد کرتے ہوئے وحی کی حاکمیت کا انکار کر دیا ہے اور اپنی عقل کو (اور درحقیقت ہوائے نفس کو) اپنا رہنما مان لیا ہے اور اسے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا ہے کہ وہ طے کرے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ اور یہ کہ زندگی اسے کیسے گزارنی ہے؟ لہذا آج صحیح طرز فکر کے حامل اہل علم و فضل کے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ آج کے انسان نے عقل کے نام پر جو یہ بے عقلی کی حرکت کی ہے، اسے اس کا احساس دلانے تاکہ وہ اپنی اس غلطی کے حصار سے باہر آ سکے۔

۸۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معاشرے جو اپنے آپ کو مسلم کہلاتے ہیں، وہاں بھی آج کا انسان کئی طرح کی ایسی جکڑ بند یوں اور موانع میں محصور ہے جنہوں نے اسے عبودیت اور انسانیت کی منزل تک نہیں پہنچنے دیا، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

i۔ بہت سے لوگ صرف اس لیے مسلمان ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں گویا محض معاشرتی ماحول کی وجہ سے ان کا نام عباد اللہ کی فہرست میں درج ہے جب کہ حقیقتاً وہ شعوری طور پر مسلمان نہیں ہیں یعنی انہوں نے علم و اختیار کی بنیاد پر شعوری انتخاب سے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ انہیں اللہ کی کبریائی کو تسلیم کر کے اس کی عبودیت کی زندگی گزارنی ہے۔

ii- جس درست رویے کا نام اسلام ہے، اس کے بنیادی ماخذ (یعنی قرآن و سنت) الحمد للہ آج بھی دنیا میں محفوظ و مامون موجود ہیں لیکن اسلام کے نام لیواؤں کی ایک بہت بڑی تعداد ان مآخذ سے غافل پڑی ہے، وہ ان سے استفادہ نہیں کرتی بلکہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان مآخذ سے استفادہ کرنے کی نہ صلاحیت رکھتی ہے نہ خواہش۔ بلکہ اسلام کے بہت سے نام لیوا ایسے ہیں جنہوں نے قرآن و سنت کی بجائے اپنے علماء و صلحاء کو معیارِ حق بنا رکھا ہے اور وہ ان کے فرومودات و اجتہادات کو ہی حرفِ آخر سمجھتے ہیں یا انہوں نے دیگر کئی طرح کے توہمات و تعصبات کو مشعلِ راہ بنا رکھا ہے۔

iii- اسلام کے بہت سے نام لیوا ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنا نام تو مسلمانوں کی فہرست میں درج کر رکھا ہے لیکن مغرب کی غالب فکر و تہذیب کے زیر اثر انہوں نے شعوری و فکری طور پر اہل مغرب کے فکر و عمل کو اپنا رکھا ہے جنہوں نے اپنی باگیں اللہ کی بجائے اپنی عقل و نفس کے حوالے کر رکھی ہیں۔ صحیح طرز فکر و عمل کے حامل مسلم اہل علم و فضل علم کے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ بھی ہے کہ وہ اسلام کے ان برائے نام پرستاروں کو سچا انسان اور سچا مسلمان بننے میں مدد دیں تاکہ ان کے فکر و عمل میں حقیقی تبدیلی جگہ پاسکے۔

۹- دوسروں کے لیے محبت اور ایثار بلاشبہ ایک صحیح انسان اور سچے مسلمان کے لیے ضروری ہیں لیکن یہ حق کے پورے پہنچ کا ایک معمولی جزو ہیں۔ یہ بلاشبہ جزو حق ہیں لیکن پورا حق بہر حال نہیں ہیں۔

۱۰- ہمارے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا صحیح تصور انسان یہ ہے کہ بحیثیت بشر، انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اللہ نے اسے شعور عطا کیا ہے، اسے انتخاب کی آزادی دی ہے اور اس مادی کائنات کے استعمال و تسخیر پر اسے ابھارا ہے لیکن یہ آدھا سچ ہے۔ باقی کا آدھا سچ یہ ہے کہ بشر کو انسان بننے کے لیے یہ درکار ہے کہ وہ اپنے انتخاب کا صحیح استعمال کرے جو یہ ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنی آزادی سے دست بردار ہو جائے اور اللہ کی غلامی قبول کر لے۔ عبودیت کا یہ رویہ ہی بشر کو انسان بنانے کی کلید ہے۔ انسان اگر ایک اللہ کے سامنے جھک جائے تو پھر اسے کسی اور کے سامنے جھکنے کی حاجت نہیں رہتی بلکہ پھر ساری کائنات اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔ صحیح کہا تھا اقبال نے کہ۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لیکن اگر انسان غلط فیصلہ کرے اور اللہ کی عبودیت کو رد کرتے ہوئے عقل و نفس کا غلام بن جائے تو وہ دو ناگوں والے جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے اور اللہ جیسی رحیم و کریم و حلیم ہستی نے اسے گدھے اور کتے کی

مثلاً قرار دیا ہے (۱)۔ غرض مسئلہ یہ نہیں کہ انسان مجبوس ہے اسے آزاد کرایا جائے بلکہ حقیقت اس کے الٹ ہے کہ آج کا انسان آزاد بلکہ مادر پدر آزاد ہے اور اس امر کی ضرورت ہے کہ اسے وحی کا پابند بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے فرمانبردار بندوں میں شامل کرے اور نفس و شیطان کے شر سے محفوظ رکھے (آمین)۔

### استدراک

ہم نہ مفکر نہ فلسفی اور نہ دعویٰ علم و تحقیق بلکہ محض ایک طالب علم۔ البرہان (دسمبر ۲۰۱۳ء) میں جب ہم نے آئن سٹائن کو انکار خدا پر طعنہ بے عقلی دیا تو ہمیں ڈر تھا کہ کوئی صاحب علم ہماری خبر لیں گے لیکن خاموشی رہی۔ اب ہم ڈاکٹر علی شریعتی پر نقد کر رہے ہیں تو اصحاب علم سے درخواست ہے کہ اگر وہ ہمارے موقف کو کمزور پائیں تو ہماری رہنمائی فرمائیں۔ البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

### بقیہ تبصرہ کتب ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

تک کے اخباری تراشوں سے امریکہ و یورپ میں عورتوں کی حالت زار پر روشنی ڈالی ہے کہ وہاں عورت کس طرح ذلت کا شکار ہے، جنسی درندگی کی زد میں ہے۔ عورتوں سے مار پیٹ اور لڑائی جھگڑے روز کا معمول ہیں۔ اسے ملازمت بھی کرنی پڑتی ہے، گھر داری بھی سنبھالنی پڑتی ہے اور بچے بھی پالنے پڑتے ہیں۔ یوں اس کی زندگی سخت مشکل میں ہے۔

توقع ہے یہ تحریر مغرب زدہ خواتین و حضرات کی آنکھیں کھولنے میں مدد ثابت ہوگی اور جو لوگ اسلامی اصول و اقدار کو گھر کی مرغی سمجھ کر اہمیت نہیں دیتے وہ سمجھ جائیں گے کہ اسلامی تعلیمات گہری حکمت پر مبنی ہیں اور صرف یہی اس دنیا میں انسانوں کو حقیقی سکھ اور سکون دے سکتی ہیں۔

۹۵ صفحات کا یہ کتابچہ لاہور میں کتاب سرائے (۳۷۹۸۸۴-۰۴۲) اور کراچی میں فضلی بک، سپر مارکیٹ (۳۲۲۱۲۹۹۱-۰۲۱) سے دستیاب ہے اور اس پر قیمت درج نہیں۔

## تزکیہ نفس - چند بنیادی مباحث (سوالاً جواباً)

**سوال:** اصولاً آپ کی بات ٹھیک لگتی ہے کہ اگر انسانی تعلقات کی تینوں جہتوں کو اسلامی تعلیمات (ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات) کے تحت لے آیا جائے تو نفسِ انسانی کا تزکیہ ہو جائے گا، لیکن واضح نہیں ہوئی۔

**جواب:** وضاحت کے لیے ہمیں ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا اور ایک ایک شعبے کی کارکردگی کا ذکر کرنا پڑے گا۔ ایمانیات ان نظریات و عقائد کو کہتے ہیں جن پر ایک انسان ایمان لاتا اور پختہ یقین رکھتا ہے۔ جتنا پختہ ایک انسان کا یقین ہوگا اتنا ہی یہ ایمانیات اس کے فکر و عمل کی بنیاد بنیں گے اور جس قسم کے یہ ایمانیات ہوں گے اسی قسم کی اس کی شخصیت بنے گی۔ مثلاً اسلامی ایمانیات کا ایک جز تو حید ہے جس کا ایک تصور یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اب اس تصور پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کبھی بھی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے کیونکہ وہ عہد، نوکر اور غلام بڑا ڈھیٹ اور بے شرم ہے جو اپنے مالک کے سامنے، اس کے دیکھتے ہوئے، اس کی موجودگی میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے جب کہ اس کو یہ بھی بتایا گیا ہو کہ جو خلاف ورزی بھی وہ کرے گا اس کو ریکارڈ کر لیا جائے گا، اس کے اپنے ہاتھ پر اس خلاف ورزی کی گواہی دیں گے اور پھر ایک دن اسے اس خلاف ورزی کا حساب دینا پڑے گا۔ اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے اللہ نے سخت سزا کا انتظام کر رکھا ہے اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتا ہے کہ اس سزا کو نافذ کرے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ان باتوں پر پختہ یقین رکھتا ہو تو وہ کیسے ان تینوں نوع کے تعلقات کے بارے میں دیئے گئے اللہ اور اس کے بھیجے ہوئے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کا ایک اہم شعبہ عبادات کا ہے۔ عبادت صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے اور اس کا بنیادی مقصد بندے کو اللہ سے جوڑنا ہوتا ہے تاکہ اللہ کو پانے کی جو پیاس اس کی فطرت میں رکھی گئی ہے اس کی تشفی ہو تاکہ اس کا قرب اسے حاصل ہو، تاکہ بندہ اس کے احکام کی اطاعت کر کے اس کی رضا حاصل کر سکے اور یہ احکام چونکہ انسانی تعلقات کی محض ایک جہت (بندے کا اللہ سے تعلق) کا احاطہ نہیں کرتے (اگر عبادت سے صرف اتنا ہی مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ بندوں کو حکم دیتا کہ وہ گھروں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہیں اور غور و مراقبہ میں مصروف رہیں) بلکہ انسانی تعلقات کی تینوں جہتوں کا احاطہ کرتے ہیں

لہذا اس نے عبادت کی شکل بھی اس طرح کی رکھی جس سے تینوں جہتوں کا احاطہ ہوتا ہو مثلاً نماز کی یہ شکل مقرر کی کہ محلہ کے مسلمان ایک مشترکہ جگہ (مسجد) میں دن میں پانچ بار جمع ہو کر اور مل کر اللہ کی عبادت کریں۔ ہفتے میں ایک معین دن (جمعۃ المبارک) ساری آبادی جمع ہو اور سال میں دو بار معین دنوں میں (عید الفطر والاضحیٰ) سارا شہر جمع ہو کر عبادت کرے اور اسی طرح کچھ معین ایام (ماہ حج) میں ساری دنیا کے مسلمان ایک جگہ (مکہ المکرمہ میں) جمع ہو کر عبادت کریں تاکہ وہ اللہ کا قرب بھی حاصل کریں اور جو دیگر مقاصد نماز باجماعت سے مسلمان محلہ کی سطح پر حاصل کرتے ہیں وہ آبادی، شہر اور ملکوں کی سطح پر سارے مسلمانوں کو حاصل ہوں۔

نماز کے بعد زکوٰۃ کو لیجیے۔ اس کا بنیادی مقصد بھی یہ ہے کہ بندہ اللہ کا دیا ہوا مال اس کے حکم کے مطابق اس کی راہ میں خرچ کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرے لیکن اس سے یہ بھی مقصود ہے کہ مال کی محبت کم ہو تاکہ دنیا کی محبت میں کمی اور آخرت کی محبت میں اضافہ ہو، مال میں برکت اور افزائش ہو، غریب مسلمانوں کی مدد ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہی حال روزے اور حج کا ہے کہ ان عبادات کا بنیادی مقصد بندے کو اللہ سے جوڑنا ہے لیکن ان کی مشینری اللہ نے ایسی وضع کی ہے کہ اس سے تینوں جہتوں کی درستی کا کام لیا ہے چنانچہ شریعت میں کثرت عبادت و نوافل محمود ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے ساری رات عبادت سے منع کر دیا تاکہ اہل و عیال کے حقوق ضائع نہ ہوں اور انسان کے اپنے نفس کا حق ضائع نہ ہو (کہ آرام کرنا اس کا حق ہے)۔ مسلسل روزے رکھنے سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمادیا کہ اس سے بندوں کے حقوق اور انسان کے ذاتی حق (آرام و صحت) کی نفی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ شریعت نے عبادات کی جو شکل مقرر کی ہے وہ انسانی تعلقات کی تینوں جہتوں کو متوازن رکھتی ہے تاکہ کسی ایک تعلق پر اس طرح زور نہ دیا جائے کہ دوسری جہات غیر متوازن ہو جائیں۔ انسانی تعلقات کی ان تینوں جہات پر شریعت کے بتائے ہوئے متوازن طریقے سے جب عمل ہو تو شخصیت کا صحیح تزکیہ ہوتا ہے اور معیاری اور متوازن شخصیت پروان چڑھتی ہے۔

عبادت کی جو مثال ہم نے دی ہے اس کا انطباق ہم اخلاقیات اور معاملات پر بھی کر سکتے ہیں مثلاً اخلاقیات میں صبر کی مثال لیجیے۔ ایک شخص کا کوئی عزیز فوت ہو جاتا ہے۔ اب اگر یہ شخص واویلا شروع کر دیتا ہے کہ وہ اجڑ گیا، لٹ گیا، بے وقت موت ہو گئی، اس کا کیا بنے گا؟ وغیرہ وغیرہ تو یہ اس شخص کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی خامی ہے کیونکہ ہر شخص کے مرنے کا اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، یہ ہر شخص کی تقدیر ہے، اس پر صبر نہ کرنا گویا اللہ کے حق کی نفی ہے، اس کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ یہ شخص اگر اس صدمے کو سر پر اتنا سوار کر لیتا ہے کہ اس کا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے یا نوکری چھوٹ جاتی ہے، وہ

لوگوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور صبر نہیں کرتا تو یہ لوگوں کے ساتھ اس کے رویے کی غلطی ہے، اس میں اہل و عیال کے حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ اسی طرح مہینوں گزر جانے کے باوجود اگر اس کی یہ حالت ہے کہ وہ نہ وقت پہ کھاتا ہے، نہ نہاتا ہے، نہ صاف کپڑے پہنتا ہے اور صبر نہ کر کے اس صدمے کو اپنے اوپر طاری رکھتا ہے تو گویا وہ اپنی حرکتوں سے خود اپنے نفس کے حقوق کی بھی نفی کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہ اسلام کے مقرر کیے گئے اخلاق حمیدہ میں سے صبر کی صفت کو اپناتا تو اللہ کے، بندوں کے اور اپنے نفس کے حقوق ضائع نہ کرتا اور شریعت کے مقرر کردہ ایک حکم صبر کی خلاف ورزی کر کے اس نے انسانی تعلقات کی ان تینوں جہتوں کو غیر متوازن کر دیا۔

ایک مثال معاملات کی بھی سنئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص جائز اور حلال طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتا ہے وہ ثواب کا حق دار ہے۔ صحابہؓ حیران ہوئے اور کہا کہ اس میں ثواب کی کیا بات ہے۔ یہ تو انسان کی اپنی خواہش ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ سوچو کہ اگر وہ اس خواہش کو حرام طریقے سے پورا کرتا تو کتنی خرابی واقع ہوتی؟ مزید غور کیجئے تو آپ سمجھ جائیں گے کہ ایک فعل جو ایک شخص کا خالص ذاتی فعل ہے اس پر وہ ثواب کا حق دار اس لیے ہے کہ ایک شخص اگر کوئی فعل اللہ کے حکم کے مطابق کرتا ہے تو اللہ اس سے خوش ہوتا ہے اور اسے جزا اور انعام سے نوازتا ہے۔ یہ گویا اس ذاتی فعل کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق حق اللہ سے ہے۔ یہی عمل اگر کوئی شخص اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کرے گا تو مستوجب سزا ہوگا، اللہ کی ناراضی کا حق دار ٹھہرے گا۔ یہ اس معاملے کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ اب بندوں سے تعلق کے حوالے سے سوچیے۔ اگر کوئی شخص یہ فعل حرام طریقے سے کرے گا تو معاشرے میں فساد پھیلے گا، لڑائی جھگڑے ہوں گے، قتل و غارت ہوگی، معاملے عدالتوں میں جائیں گے، پیسہ خرچ ہوگا، اوقات ضائع ہوں گے، محنت ضائع ہوگی۔ غرض انسانوں کے حقوق کی تلفی کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ خود اس شخص کے ذاتی حقوق بھی ضائع ہوں گے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا، اگر وہ جیل جاتا ہے تو اس نے اپنی حماقت سے اپنے آپ کو تعذیب میں ڈالا۔ آرام، راحت، سکون سے محروم ہوا، اس کے پیسے بھی ضائع ہوئے۔ ممکن ہے وہ اس جرم کے بدلے میں قتل کر دیا جائے تو اس نے اپنے نفس کو بھی ضائع کر دیا اور آخرت میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوگا اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ معاملات کے سلسلے میں شریعت نے جو احکام دیے ہیں ان میں سے ایک کی مثال ہم نے دی کہ اگر وہ کام شریعت کے حکم کے مطابق کیا جائے تو تینوں جہتوں میں توازن و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور انسان کا تزکیہ ہوتا ہے اور اگر وہ کام شریعت کے خلاف کیا جائے تو تعلقات کی یہ تینوں جہتیں بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔

ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات کی جو مثالیں ہم نے اوپر دی ہیں ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ہم دین کی تعلیمات پر صحیح طریقے سے عمل کریں تو انسانی تعلقات کی تینوں جہتوں کی متوازن طریقے سے نشوونما ہوتی ہے اور انسان کا مکمل تزکیہ نفس ہو جاتا ہے۔

**سوال:** تو ایمانیات اور عبادات کو بھی آپ تزکیہ نفس کا وسیلہ سمجھتے ہیں؟

**جواب:** ہم نے پوری تفصیل سے اپنا یہ نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ساری شریعت نفس انسانی کا تزکیہ کرتی ہے اور انسانی تعلقات کی تینوں جہات کی متوازن نشوونما کرتی ہے۔ آپ کے سوال میں جو بات رمز یہ طور پر موجود ہے اس کی صحیح تفہیم کے لیے دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں:

**ایک:** جب ہم یہ کہتے ہیں کہ شریعت ساری کی ساری بشمول ایمانیات و عبادات نفس انسانی اور انسانی تعلقات کی تینوں جہات کا متوازن طریقے سے تزکیہ کرتی ہے تو اس سے ایمانیات و عبادات کی تحقیر کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ کچھ لوگوں کو اس میں تحقیر کا غیر موجود پہلو بھی موجود نظر آ سکتا ہے لیکن اس کی وجہ ان کے تصور دین کا نقص ہے نہ کہ ہمارے نقطہ نظر کی غلطی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ صدر اول میں تصوف کی ابتداء ہوئی ہی اس حوالے سے تھی کہ لوگوں کے دلوں میں دنیا کی محبت گھر کر گئی تھی اور فکر آخرت کم ہو گئی تھی چنانچہ رد عمل کے طور پر کچھ لوگوں میں کثرت عبادت کا ذوق اور سادہ زندگی گزارنے کا شوق ابھرا جن کو لوگ زہاد کہتے تھے۔ بعد میں یہ رویہ اس طرح پروان چڑھا کہ دین کے دوسرے شعبوں خصوصاً معاملات کے بارے میں دینی تعلیمات نظر انداز ہونے لگیں۔ ساتھ ہی بدقسمتی سے سیاسی نظام میں خرابی پیدا ہو گئی کہ علماء و صلحاء نظام حکومت سے الگ کر دیئے گئے اور انہوں نے مساجد و مدارس کو آباد کر لیا۔ اس صورت حال سے دین و دنیا میں تفریق کا غیر اسلامی تصور ابھرا اور معاملات کو لوگ دنیا داری سمجھنے لگے اور عبادات وغیرہ میں معاملات کا جو پہلو تھا وہ دب گیا، ورنہ قرآن و سنت اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں یہ تفریق موجود نہیں۔ مثال کے طور پر مسجد کے ادارے کو لیجیے۔ مسجد صرف نماز کی جگہ نہ تھی، منصب صدارت کا الیکشن بھی وہیں ہوتا تھا۔ جنگی ہیڈ کوارٹر بھی وہی تھی، ساری سیاسی مشاورتیں وہیں ہوتی تھیں حتیٰ کہ تفرق و ثقافت کا مرکز بھی مسجد تھی۔ لوگ اس میں صرف ذکر اللہ ہی نہیں کرتے تھے شعر گوئی اور لطیفہ بازی کی مجلس بھی جماتے تھے یہاں تک کہ سرور عالم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اہلیہ کو بازیگروں کا تماشا بھی صحن مسجد میں دکھایا۔ یہ ساری باتیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں لیکن آج یہ باتیں لوگوں کو اوپری لگتی ہیں اس لیے کہ ہم نے مسجد کا کردار بدل دیا ہے۔

یہ ایک مثال تھی اسی طرح ہر شعبے کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ہم صرف ایک صحیح حدیث اور پیش کریں



گے کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں صحابہؓ نے ایک آدمی کے بارے میں، جو محنت مزدوری میں کوشاں و منہمک تھا کہا کہ کاش وہ اتنی محنت دیتی کاموں میں کرتا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر وہ اپنے اہل و عیال کو حلال رزق بہم پہنچانے کے لیے یہ محنت کر رہا ہے تو وہ عبادت ہی کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دین اسلام نے اللہ کی عبادت کا کوئی ایسا طریقہ تجویز نہیں کیا جس سے انسانی تعلقات کی دوسری جہات کا توازن خراب ہو بلکہ دین کی جتنی بھی تعلیمات ہیں وہ زندگی کی ان تینوں جہات میں ایک توازن پیدا کرتی ہیں جس سے ایک متوازن شخصیت جنم لیتی ہے اور انسان کا مکمل تزکیہ ہو جاتا ہے۔

**دوم:** یہ بات بھی غلط فہمی کا سبب نہیں ہونی چاہیے کہ احکام شریعت کو تزکیہ نفس کا وسیلہ کہنا گویا ان کی فضیلت کو کم کرنا ہے کہ وسیلے کا درجہ ہدف اور مقصود سے کم ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تزکیہ وسیلہ ہے احکام شریعت پر عمل کرنے کا یعنی جتنا اچھی طرح شخصیت کا تزکیہ ہوگا اتنے ہی اچھے طریقے سے اعمال بجا لائے جاسکیں گے اور اس کے برعکس بھی صحیح ہے یعنی احکام شریعت وسیلہ ہیں تزکیہ کا یعنی جتنا اچھی طرح احکام شریعت پر عمل ہوگا اتنا ہی عمدہ تزکیہ ہوگا۔ اسی طرح احکام شریعت پر صحیح طریقے سے عمل ہدف ہے تزکیہ نفس کا اور اعمال شریعت بجالانے کا ہدف ہے اطاعت۔ اطاعت کا ہدف ہے اللہ کی رضا اور گو بظاہر اللہ کی رضا آخری ہدف لگتا ہے لیکن کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی ہدف ہے اللہ کی نعمتوں کے حصول کا۔ اور اگر اس کے برعکس سوچئے تو بھی صحیح ہے کہ تعلیم وسیلہ ہے تزکیہ کا، تزکیہ وسیلہ ہے، احکام شرعی پر عمل کا، احکام شرعی پر عمل وسیلہ ہے اطاعت کا، اطاعت وسیلہ ہے اللہ کی رضا کا اور اللہ کی رضا وسیلہ ہے اللہ کی نعمتوں کا۔ تو گویا یہ سارے ادارے بیک وقت وسیلہ بھی ہیں اور ہدف بھی۔ لہذا یہاں ہدف اور وسیلے کی بحث افضل و مفضول کی بحث ہے ہی نہیں، نہ اسے اس تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

**سوال:** تزکیہ نفس اور اس طرح کی دوسری اصطلاحات مثلاً احسان، تصوف، طریقت، حقیقت، سلوک وغیرہ میں کیا فرق ہے؟

**جواب:** تزکیہ نفس اور ان اصطلاحات میں فرق ہے جو ذیل میں واضح کیا جاتا ہے۔

**تزکیہ نفس:** جامع قرآنی اصطلاح ہے جس کا مفہوم ہم نے ابھی اوپر واضح کیا ہے۔ مختلف قسم کی غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے۔

**تصوف:** وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں نے حصول تزکیہ نفس کے لیے قائم کیا۔ اس کے دو عملی اہداف تھے: ایک مسلمانوں کو معصیت سے بچانا اور دوسرے ان کو اعلیٰ درجے کا مسلمان بننے میں مدد دینا۔

**احسان:** احسان کا ایک مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو بہترین اور احسن طریقے سے انجام دینا (یعنی

(Excellence) حدیث جبریل علیہ السلام میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ سے پہلے پوچھا کہ ایمان کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے جواب میں اسلام کے عقائد گنوا دیے (یعنی توحید، رسالت وغیرہ)۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے اہم اعمال گنوا دیے (جیسے نماز، روزہ وغیرہ)۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ (یعنی ان اعمال کو اعلیٰ اور احسن طریقے سے کیسے انجام دیا جائے؟) تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ (سارے) اعمال عبودیت (یعنی عبادات، اخلاقیات، معاملات وغیرہ) یہ تصور کرتے ہوئے بجالائے جائیں کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں یا (اگر یہ تصور نہ ہو سکے تو یہ کہ) اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ گویا اعمال عبودیت بجالاتے ہوئے ذات باری کا استحضار کہ ہم اس کے حضور حاضر ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ احسان تصوف کے عملی اہداف میں سے ہے کہ انسان اعلیٰ درجے کا مسلمان کیسے بنے؟

**طریقت:** طریق عربی میں راستے کو کہتے ہیں۔ اس سے مقصود ہے وہ راستہ جس پر چل کر نفس کا تزکیہ حاصل کیا جاسکے۔

**حقیقت:** اگر اعمال شریعت کی اس طرح تشریح کی جائے کہ ایک ان کی ظاہری شکل ہے اور دوسرے ان کی داخلی سپرٹ، تو حقیقت کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف شریعت کے ظاہری اعمال ہی نہ بجا لائے جائیں بلکہ ان کی داخلی سپرٹ بھی حاصل ہو مثلاً ایک تو نماز کے ظاہری اعمال (قیام، رکوع، سجود اور ان میں پڑھے جانے والے اذکار) ہیں اور دوسرے اس کی داخلی سپرٹ جیسے خضوع و خشوع اور منکرات و معاصی سے بچنا۔

**سلوک:** سلوک کے ایک معنی تو راستہ چلنے کے ہیں۔ اس صورت میں یہ طریقت کا مترادف ہوگا یعنی وہ سیدھا راستہ جس پر چل کر تزکیہ نفس کی منزلیں طے کی جاسکیں۔ اور اس کے دوسرے معنی برتاؤ، رویہ اور طرز عمل کے ہیں۔ اس صورت میں اس کے معنی ہوں گے ”اپنے رویے اور طرز عمل کی اس طرح اصلاح کرنا کہ تزکیہ نفس حاصل ہو جائے۔“

ان اصطلاحات کی مختصر تشریح سے واضح ہو گیا کہ تزکیہ نفس ہی جامع، قرآنی اور قابل ترجیح اصطلاح ہے تاہم یہ دوسری اصطلاحات بھی چونکہ صدیوں سے مسلمانوں میں مروج ہیں اور ہماری علمی اور تہذیبی تاریخ کا ایک حصہ ہیں لہذا ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ان سے حساسیت برتنے کی کوئی ضرورت ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص ان اصطلاحات کی ایسی تشریح کرے جن سے انہیں شریعت سے متصادم یا اس کے مقابل کی کوئی چیز ظاہر کرے تو یہ سو فیصد خلاف واقعہ اور خلاف اسلام ہوگا اور یہ چیز ہرگز

قبول نہ کی جائے گی۔

**سوال:** جب شریعت تزکیہ نفس کے لیے کافی ہے تو پھر تصوف کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

**جواب:** یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے علم اصول تفسیر، علم تفسیر اور دیگر علوم القرآن کی کیا ضرورت ہے؟ یا احادیث کے ہوتے ہوئے علم اصول حدیث، علم اسماء الرجال اور علم جرح و تعدیل کی کیا ضرورت ہے، اور قرآن وحدیث میں جب احکام موجود ہیں تو علم فقہ اور اصول فقہ کی کیا ضرورت ہے؟ یا آنحضرت ﷺ کے زمانے میں دینی مدرسے نہیں ہوتے تھے لہذا آج دینی مدرسوں کی کیا ضرورت ہے؟ یا قرآن وسنت کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی کیا ضرورت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اصل بات یہ ہے کہ انسانی زندگی بڑی متنوع ہے اور انسان کو جزئیات تک میں اتر کر بڑی تفصیلی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر جو کتاب نازل فرماتے ہیں وہ بہر حال محدود ضخامت کی حامل ہوتی ہے۔ نبی جب تک زندہ ہوتا ہے وحی کی روشنی میں تفصیلی رہنمائی مہیا کرتا ہے لیکن وہ انسان ہے، فوت ہو جاتا ہے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

پیغمبر کی سنت، کتاب اللہ سے زیادہ تفصیلی رہنمائی مہیا کرتی ہے لیکن یہ تفصیلی جزئیات بھی بہر حال محدود ہوتی ہیں لیکن جہاں تک معاشرے کا تعلق ہے تو اجتماعی زندگی کی گاڑی آگے بڑھتی رہتی ہے، تمدنی بولچھونیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں اسلامی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ان مسائل کا حل پیش کیا جائے، نئی آراء قائم کی جائیں، نئے علوم ایجاد کیے جائیں، نئے ادارے قائم کیے جائیں۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ یہ کام اسلام کے منصوص اہداف کے حصول کے لیے کیے جائیں اور قرآن وسنت کی روشنی میں کیے جائیں۔ اس صورت میں یہ اسلامی ہوں گے اور اگر ان دو شرطوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ غیر اسلامی ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ تزکیہ نفس اسلام کا ایک منصوص ہدف ہے۔ اگر اس کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں کوئی ادارہ قائم کیا جائے، کوئی تفصیلات مرتب کی جائیں تو یہ اسلامی ہوں گی غیر اسلامی نہیں۔ ہاں اگر اس ادارے کا ہدف کچھ اور ہو اور اس کا منبع قرآن وسنت نہ ہو تو وہ غیر اسلامی ہوگا اور ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

## فتنہ تکفیر اور خارجیت جدیدہ..... یک رُنے تجزیے ہوئی تقصیر تو کچھ باعث تقصیر بھی تھا

ہم نے البرہان شمارہ مارچ ۲۰۱۵ء میں مسئلہ تکفیر پر ڈاکٹر عبدالقادر صاحب کا مضمون طبع کیا تھا اور اس کے آخر میں کچھ گزارشات بھی پیش کی تھیں لیکن اس کے حق میں یا اس کے خلاف ہمیں کوئی مضمون موصول نہیں ہوا، اس لیے ہم نے اس موضوع پر خود قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ البرہان اس موضوع پر سنجیدہ علمی مضامین کا خیر مقدم کرے گا۔ مدیر

۱- ہم مذہبی انتہا پسندی، دہشت گردی اور معمولی اختلافات پر عام مسلمانوں کی تکفیر کرنے اور انہیں واجب القتل قرار دینے کو غلط سمجھتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ ہمارا دلوک موقف ہے اور اس میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے..... تاہم جب ہم اس کی تفصیل میں جاتے ہیں کہ اس انتہا پسندی اور دہشت گردی کا سبب کیا ہے، اس کے پھیلنے کے عوامل کیا ہیں اور ان کا سد باب کس طرح ہو سکتا ہے؟ تو ہمارا اختلاف ان لوگوں سے شروع ہو جاتا ہے جو اس پر یک رُنے تبصرے کرتے ہیں اور موضوع سے انصاف نہیں کرتے۔

۲- ایک مخلص حکیم حاذق کے پاس جب کوئی مریض آتا ہے تو اس کے پیش نظر مریض کی تکلیف وقتی طور پر دور کرنا اور مرض کی علامتیں ختم کرنا ہی نہیں مرض کو جڑ سے ختم کرنا ہوتا ہے تاکہ مریض کو ہمیشہ کے لیے اس مرض سے نجات مل جائے اور بیماری کا تملہ دوبارہ نہ ہو جائے جب کہ عطائی اور لالچی ڈاکٹر و حکیم جسے مریض کا مرض دور کرنے کے مقابلے میں اپنی فیس اور پیسے عزیز تر ہوں، وہ وقتی طور پر مرض کی علامتیں ختم کرنے اور مریض کی تکلیف وقتی طور پر دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، مرض کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یقیناً جسد امت کو اس وقت فرقہ واریت، انتہا پسندی، دہشت گردی اور فتنہ تکفیر جیسے امراض لاحق ہیں لیکن آئیے اس کا علاج ایک مخلص حکیم حاذق کی طرح کرنے کا سوچیں نہ کہ عطائیوں کی طرح اور لالچی ڈاکٹروں حکیموں کی طرح مریض کو ڈرانے، اس کی بیماریوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور اس سے زیادہ سے زیادہ مال انٹھنے کا سوچیں۔

۳- مسلمانوں میں فرقہ واریت، انتہا پسندی، دہشت گردی اور فتنہ تکفیر کے اہم عوامل ہماری

رائے میں درج ذیل ہیں:

### فرقہ وارانہ تعلیم و تربیت

یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہمارے معاشرے میں دین سے مراد مسلک اور فرقہ لیا جاتا ہے۔ دینی مدارس میں تعلیم مسلک کی دی جاتی ہے۔ ہر مسجد کسی نہ کسی مسلک کی ہوتی ہے۔ دینی سیاسی جماعتیں بھی مسلک کی بنیاد پر بنائی جاتی ہیں۔ یہ سب امور فرقہ واریت اور مسلک پرستی پر منتج ہوتے ہیں، مسلک کے لیے تعصب کو جنم دیتے ہیں اور بین الممالک رواداری کو کم کرتے ہیں۔ دین میں رسوخ نہ رکھنے والے، جذباتی اور مناظرانہ ذہن رکھنے والے واعظ، مولوی اور ذاکرا اختلافات کو ابھارتے اور اشتعال انگیز ماحول پیدا کرتے ہیں۔ یہ رویے جب عوامی سطح تک پہنچتے ہیں تو معاشرتی تقسیم، طبقاتی تفریق، فکری انتشار اور ذہنی خلفشار کا سبب بنتے ہیں۔ فرقہ بندی جتنی کو جنم دیتی ہے، مسلک مدارحق و باطل بن جاتا ہے اور مخالف مسلک کی تغلیط اور اس کا ابطال ایک دینی فرض بن کر ابھرتا ہے۔ تاہم یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ علماء کرام میں ایسے لوگ بھی ہیں جو رسوخ فی العلم رکھتے ہیں اور ثقہ و معتدل مزاج ہیں اور ان خرابیوں میں مبتلا نہیں۔

### علماء کا رسوخ و اقتدار

قرآن و سنت اہل علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ قراء و علماء کو خلفائے راشدین کی مجلس شوریٰ میں خصوصی اہمیت حاصل تھی اور مفسرین ان کو اولی الامر کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ پھر جب سیاسی حکمران دینی مفادات سے دور ہوتے گئے اور اہل علم و فضل سے ان کا ٹکراؤ ہوا جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت پر منتج ہوا تو اہل علم و صلاح نے سیاست سے صرف نظر کر کے مساجد و مدارس اور رابطوں اور زاویوں کو آباد کرنا شروع کر دیا اور مسلم معاشرے نے بحیثیت مجموعی تعلیم، تزکیہ اور ثقہ کے شعبے حکومت کی بجائے علماء کے سپرد کر دیئے چنانچہ تعلیم، تزکیہ اور ثقہ و اصول فقہ تقریباً بارہ صدیوں تک علماء کے ہاتھ میں رہے۔ اس سے مسلم معاشرے میں علماء و صلحاء کی توقیر اور رسوخ میں کمی کی بجائے اضافہ ہوا۔ حکمران اگر لوگوں کی گردنوں پر حکومت کرتے تھے تو لوگوں کے دلوں پر حکومت ان علماء و صلحاء کی تھی جس پر کئی حکمران رشک کرتے تھے اور جوان کو حریفانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے وہ اپنا نقصان کرتے تھے۔ ان علماء و صلحاء کے علم و تقویٰ پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ لاکھوں لوگ بغیر کسی حکومتی جبر کے ان کے فقہی موقف پر عمل کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی کروڑوں مسلمان بغیر کسی حکومتی ترغیب اور دباؤ کے ان فقہی مذاہب سے وابستہ ہیں۔ حکمرانوں کے آج بھی وہی انداز ہیں اور مسلمان عوام کی بہت بڑی اکثریت

دینی امور میں آج بھی حکمرانوں اور ان کی پارلیمانوں کے مقابلے میں ان بورئہ نشینوں کے فتوؤں پر زیادہ اعتماد کرتی ہے۔ تلامذہ اپنے دینی اساتذہ کے لیے اور مریدین اپنے شیوخ کے لیے جان دینا بھی سعادت سمجھتے ہیں۔

ان حقائق نے علماء میں ایک نوع کی برتری، بالادستی اور تفاخر کی فضا پیدا کر دی ہے جو بگڑ کر بعض اوقات تکبر و نخوت کی صورت اختیار کر لیتی ہے ان حالات کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ آج سعودی عرب اور ایران کے سوا (جہاں حالات قدرے بہتر ہیں) اکثر مسلم ممالک (بشمول پاکستان) میں ریاستی اداروں اور علماء کے درمیان تعلقات حریفانہ نوعیت کے ہیں۔

### اہل مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی

پندرھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے عیسائی ہیڈ کوارٹر قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو اس نے عیسائی دینی قیادت کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کر دیا اور وہ اہل یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکانے اور انہیں متحد کر کے مسلمانوں کے خلاف سینہ سپر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ رد عمل کی اسی آگ نے نہاۃ ثانیہ کی تحریک کو ابھارا۔ مختلف عوامل کی بنیاد پر مغربی تہذیب نے جس طرح ترقی کی اس نے نہ صرف عیسائیت کو کونوں کھدروں میں دھکیل دیا بلکہ مذہب کے وجود اور وحی، خدا، آخرت جیسے تصورات کو ختم کر کے انسان کی خدائی، انسان کی لامحدود آزادی، مادہ پرستی اور دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنے پر تکیہ کر لی۔ مغربی فکر پر مبنی پورا نظام حیات اسلام اور مسلم فکر و تہذیب کے بالکل الٹ ہے۔ دوسرے مسلمانوں سے انتقام اور بدلہ لینے کا ان کا جذبہ جنون کی آخری حدود کو چھو رہا تھا جس کے اظہار کے لیے صرف ایک واقعہ کا ذکر کافی ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں جب یورپی فوجوں نے شام پر قبضہ کر لیا تو فرانسیسی جنرل نے دمشق میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو ٹھڈے مارتے ہوئے کہا کہ ”اٹھو صلاح الدین ہم آگئے ہیں“۔ اسلام اور مسلمانوں سے نفرت اور انتقام کا یہ جذبہ اتنا گہرا ہے کہ جب کچھ سال پہلے بش جونیر نے افغانستان پر حملہ کیا تو اسے صلیبی جنگ کہا (اگرچہ بعد میں سفارتی ڈپلومیسی کے تحت اس لفظ کی تکرار مناسب نہ سمجھی گئی)۔

قصہ مختصر یہ کہ اہل مغرب نے مسلم ممالک پر حملہ کیا ان کو تباہ کیا، ان کو لوٹا کھسوٹا اور مزاحمت تو توں خصوصاً علماء اور حکمرانوں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا اور پھر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنائے رکھنے کی خاطر ان کا تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی..... ڈھانچہ توڑ دیا اور اسے مغربی فکر و تہذیب کی لادین بنیادوں پر استوار کیا۔ اس نے فلسطین میں یہودیوں کو بسایا اور یوں مشرق وسطیٰ کے دل میں اسرائیل کا

خنجر گھونپ دیا۔ اس وقت عالم اسلام کے جسد میں جتنے بھی زخم رس رہے ہیں اور کشمیر، چیچنیا، بوسنیا، افغانستان، الجزائر، فلپین، سوڈان، سری لنکا، چین اور روس میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں ان سب کے پیچھے اہل مغرب اور ان کی سازشیں اور ان کی حمایت کا فرما ہے۔

دوسری طرف جعلی قرآن بنا کر چھاپا جا رہا ہے، حدیث کے خلاف مستشرقین نے مورچہ باندھ رکھا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت کو جان بوجھ کر کٹا کر کھینچا جا رہا ہے۔ قرآن کو دہشت گردی کو فروغ دینے والی کتاب قرار دے کر جلایا جا رہا ہے اور نبی رحمت ﷺ کو دہشت گردی سے متهم کر کے آپ ﷺ کے کارٹون بنا کر مسلمانوں کے سینے چھیدے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی تعلیم اور میڈیا کے ذریعے مسلمانوں کو خصوصاً ان کی نئی نسل کو سلو پوائزن (slow poison) کے ذریعے اخلاقی طور پر تباہ کیا جا رہا ہے اور جہاں کوئی مسلم ریاست اس طرح قابو نہ آئے اس پر امریکہ و یورپ اپنی مہیب جنگی مشینری سے حملہ کر کے اسے خس و خاشاک بنا دیتے ہیں چنانچہ عراق، افغانستان اور لیبیا کو تباہ کیا جا چکا ہے اور پاکستان، شام، یمن اور صومالیہ پر حملے جاری ہیں۔

اس کے ساتھ ہی امریکہ و یورپ کی پالیسی یہ ہے کہ مسلم معاشرے کو اندر سے توڑا جائے۔ مغربی ایجنسیاں فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہیں، سنی گروپوں کو آپس میں اور شیعہ سنی کو باہم لڑایا جاتا ہے۔ ایران اور عربوں کو لڑایا جا رہا ہے۔ مغربی ایجنسیاں دینی عناصر کو مشتعل کر کے حکمرانوں کے خلاف لڑنے پر انہیں اکساتی ہیں اور اسلحہ، ٹریننگ اور ڈالر انہیں دیتی ہیں۔ اُدھر حکومت کو کہتی ہیں کہ ان دہشت گردوں کو کچل ڈالو۔ یوں مغربی ایجنسیاں مسلم معاشرے میں فرقہ واریت، انتہا پسندی اور دہشت گردی کو فروغ دیتی ہیں اور خارجیت کی راہ ہموار کرتی ہیں کہ انتہا پسند مذہبی گروہ مسلم حکمرانوں کی تکفیر کریں اور انہیں واجب القتل قرار دیں۔

### مسلم حکمرانوں کا رویہ

حالات کی جو تصویر کشی ہم نے سطور بالا میں کی ہے، اس کے تناظر میں دیکھیے تو آپ سمجھ جائیں گے کہ اہل مغرب اور ان کی ایجنسیاں مسلم سیاسی اور فوجی مقتدرہ کو اپنے جال میں پھنساتی ہیں۔ انہیں جدیدیت، سیکولرزم، سرمایہ داری، آزادی، جمہوریت اور ترقی کے نام پر بہلاتی ہیں۔ انہیں قرضے دے کر الٹے تلے کرواتی ہیں اور قوم مقروض ہوتی جاتی ہے۔ وہ انہیں اقتدار دلانے میں مدد کرتی ہیں۔ اقتدار میں ہوں تو اس کے طول دینے میں ان کی اعانت کرتی ہیں۔ فوجی قیادت کو اسلحہ، ٹریننگ اور پروموشن کی ترغیب دے کر پھانستی ہیں۔ انہیں نفاذ شریعت سے دور رکھتی ہیں اور انہیں علماء اور اسلامی قوتوں سے

لڑاتی ہیں۔ مغربی اور مقامی ایجنسیاں اسلامی قوتوں کو انتخابات میں ہراتی ہیں یوں ان کے پرامن جدوجہد کرنے والے لوگ جمہوری لا حاصل جدوجہد میں بھنسے وقت ضائع کرتے رہتے ہیں اور ان میں سے بعض خصوصاً نوجوان پرامن جدوجہد کی کامیابی سے مایوس ہو کر انتہا پسندی اور خارجیت کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جن مسلم ممالک کو آزادی ملی ان میں سے تقریباً ہر ایک میں سول اور فوجی حکمرانوں اور علماء و دینی جماعتوں کے درمیان کشمکش کے یہ مناظر دیکھے جاسکتے ہیں اور یہ سب کسی سوئے اتفاق یا محض مسلمانوں کی نااہلی کا نتیجہ نہیں بلکہ مغربی ایجنسیوں کی براہ راست پلاننگ کا نتیجہ ہیں۔

اس طرح اہل مغرب مسلم حکمرانوں کو جدیدیت اور مغرب پرستی کی راہ پر ڈال کر مسلم معاشرے میں مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار رائج کراتے ہیں، نفاذ شریعت کا راستہ روکتے ہیں۔ دینی قوتوں کو ان سے مایوس کرا کر انہیں انتہا پسندی کی راہ پر ڈالتے ہیں اور انہیں حکمرانوں کی تکفیر اور ان سے مسلح جدوجہد کے وجوب کی طرف لاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مغرب نہ صرف خود مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا کر انہیں انتہا پسندی اور شدت پسندی کی طرف دھکیلتا ہے بلکہ مسلم حکمرانوں کو بھی اس غرض سے استعمال کرتا ہے اور مسلم حکمران بھی ان دین داروں پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں، شریعت نافذ نہیں کرتے، انہیں انتخابات میں ہر جائز و ناجائز ذریعے سے ہراتے ہیں اور جو تنگ آمد جنگ آمد کی راہ اختیار کریں، وہ ان پر یہ کہہ کر چڑھ دوڑتے ہیں کہ ہم ان دہشت گردوں کو ریاست کی رٹ پامال نہیں کرنے دیں گے۔ دوسری طرف مزاحمت کاروں کے منہ میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ نفاذ شریعت کے منکر یہ لوگ کافر ہیں لہذا ان کے خلاف مسلح جدوجہد جائز ہے۔ یوں اہل مغرب کی اکیخت پر ان کے ایجنٹ مسلمان حکمران خارجیت اور کفر سازی کی فیکٹریاں کھولنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

### خارجیت کی مذمت

اس وقت تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ داخلی طور پر علماء کرام اور اسلام کے لیے کام کرنے والی بعض تنظیمیں فرقہ واریت اور انتہا پسندی کے فروغ کی کسی حد تک ذمہ دار ہیں لیکن خارجی طور پر اسلام اور مسلم دشمن بیرونی طاقتیں (خصوصاً امریکہ و یورپ اور ان کے حلیف) بھی اپنی ایجنسیوں اور اپنے ایجنٹ مسلم حکمرانوں کے ذریعے مسلم معاشرے میں فرقہ واریت، انتہا پسندی اور خارجیت پھیلاتی ہیں..... لیکن بعض علماء اور دانشور اپنے یک رُنے تجزیوں کے ذریعے اس خارجیت کا ذمہ دار صرف ان جہادیوں کو ٹھہراتے ہیں جو مغربی قوتوں کے مظالم کی یا ان کے ایجنٹ مسلم حکمرانوں کے ظلم و ستم کی مزاحمت کرتے



ہیں یا ان علماء کو جو ان جہادیوں کی حمایت کرتے اور ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ وہ بھولے سے بھی اہل مغرب کی یا ان کے ایجنٹ سول اور فوجی حکمرانوں کی مذمت نہیں کرتے جو اس انتہا پسندی اور خارجیت کی پیدائش اور اس کے پھیلاؤ کے بنیادی طور پر ذمہ دار ہیں۔ لہذا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ خارجیت کی اس طرح مذمت کرنے والے یہ علماء، دانشور اور صحافی یا تو مغربی فکر و تہذیب سے متاثر و مرعوب ہیں یا اسلام اور مسلم دشمن مغربی قوتوں کی ایجنسیوں اور ان کے ایجنٹ مسلم فوجی و سول حکمرانوں کے زلہ خوار اور حمایتی ہیں۔

### پس چہ باید کرد

اس فتنہ تکفیر کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟ ہمارے تجزیے کی رو سے:

۱- اعتدال پسند علماء اور دینی جماعتوں کو متحد ہو کر اصلاحی کوششیں کرنی چاہئیں تاکہ دینی لوگ فرقہ واریت اور مسلک پرستی کی دلدل سے نکلیں، قرآن و سنت پر مجتمع ہوں، فقہی اختلافات کو ان کے مقام پر رکھیں، دینی مدارس و مساجد کو فرقہ واریت کی آماج گاہ بننے سے روکیں اور بین المسالک رواداری اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کے اقدامات کریں۔

۲- مسلمان حکمران اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔ مغربی طاقتوں کی مکارانہ چالوں اور ان کی فکرو تہذیب کی پیروی سے بچیں۔ علماء اور دینی جماعتوں سے حریفانہ کشش کی بجائے ان کی مشاورت اور تعاون سے مسلم معاشرے میں اسلامی اصول و اقدار کو رواج دیں اور مسلم معاشرے کے استحکام کا سبب بنیں۔

۳- علماء کرام اور دینی عناصر، داعیان دین اور مزاحمت کار سب مغرب کی ابلیسی پلاننگ کا ادراک کریں، اس کے جال میں پھنسنے سے بچیں اور غیر شعوری طور پر بھی اس کی چالوں میں نہ آئیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر علماء کرام و دینی جماعتیں اور ہمارے حکمران طبقے، سول اور فوجی بیوروکریسی..... سب اپنا بے لاگ احتساب کریں، خدا کا خوف کریں، اپنی عاقبت سے ڈریں، مغرب کی اسلام و مسلم دشمن فکر و تہذیب کو رد کر دیں تو مسلم معاشرے سے فرقہ واریت، انتہا پسندی اور دہشت گردی ختم ہو جائے گی اور فتنہ تکفیر اور خارجیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا، ان شاء اللہ۔

روپے کی قیمت جتنی بھی گر جائے اتنی کبھی نہیں گر سکتی جتنا انسان روپے کو حاصل کرنے کے لیے گر جاتا ہے

## دینی تحریکوں اور جماعتوں کا کام غیر موثر کیوں ہو گیا ہے؟ پیغام نہیں صداقت کی ترسیل، اہم ہے

انسان اپنی کامیابیوں کا سہرا اپنے سر باندھتا ہے اور اپنی ناکامیوں کا ذمے دار دوسروں کو ٹھہراتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ رویہ طاقتور رجحان کے بعد اب قدر (Value) اور اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ رجحان جو معاشرہ کے ایک بڑے طبقے میں کافی عرصہ تک برقرار رہا اب ایک تعصب اور بالآخر ایک قدر بن چکا ہے۔ قدر چاہے مثبت ہو یا منفی اس کی ٹوٹ پھوٹ کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے کیوں کہ قدر وہ شے ہوتی ہے جس سے انسان کے بے شمار مفادات، امیدیں، توقعات، امکانات اور خواب تک وابستہ ہوتے ہیں جس سے اس کے وجود کی معنویت متعین ہوتی ہے۔

اس وقت پاکستان میں دینی حوالے سے جتنی بھی مثبت قوتیں کام کر رہی ہیں ان کے افراد سے اکثر و بیشتر یہ بات سننے کو ملتی ہے کہ جناب ہمارے معاشرے میں لوگ اتنے بگڑ چکے ہیں کہ وہ اول تو ہماری بات سننے کو تیار نہیں اور اگر تیار ہیں تو ان پر ہماری تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس لیے اگر ہم معاشرے کے اندر کوئی تبدیلی لانے میں ناکام ہیں تو اس کی ذمہ داری ہماری بجائے معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی کوششوں میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ انہوں نے حق کا پیغام اپنی تمام توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے تک پہنچا دیا ہے اور ہماری ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ معاشرے کے کافی افراد تبدیل ہوئے ہیں۔ یعنی کامیابی کا سہرا ہمارے سر اور ناکامی کی ذمہ داری معاشرے کے سر۔

دنیا کا کوئی بھی معاشرہ صداقت کو قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوتا اور جب وہ خیر یا صداقت کو قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ فنا ہو جاتا ہے۔ ایک معاشرہ کیا بڑی بڑی تہذیبیں فنا ہو جاتی ہیں لہذا دینی تحریکوں کا یہ دعویٰ درست نہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارا معاشرہ اتنا برا ہو چکا ہے کہ اب کوئی دوا کارگر نہیں ہو سکتی۔ بیماری ایک خاص مرحلے سے آگے بڑھ جائے تو واقعی کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ ہمارا معاشرہ بھی اس مرحلے پر آ گیا ہو۔

تاہم اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے بیماری اس مرحلے سے آگے نہ بڑھی ہو بلکہ ہماری دوا میں ہی کوئی کھوٹ آ گیا ہو۔ شاید اس میں پانی کی مقدار اتنی بڑھ گئی ہو کہ شفاء بخش اجزاء بے اثر ہو کر رہ گئے ہوں یا ہماری تشخیص ہی درست نہ ہو لہذا تشخیص غلط ہو اور دوا درست ہو تب بھی شفاء نہیں ہوتی۔ یا دوا کی خوراک کم ہو یا ہو سکتا ہے کہ دوا کی خوراک زیادہ دے دی گئی ہو تمام صورتوں میں شفاء کا امکان کم ہے یعنی ممکن ہے ہماری صداقت ہی اتنی کمزور ہو کر رہ گئی ہو کہ معاشرہ پر اثر انداز نہ ہو پارہی ہو شاید نہیں یقیناً ایسا ہی ہے۔

جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں تو کسی پیغام کے بجائے کسی صداقت کا ابلاغ کرتے ہیں۔ پیغام جو لفظوں کی صورت میں ہوتا ہے اس صداقت کے ابلاغ کا ایک ذریعہ ہے یہ ابلاغ معنی کا بھی نہیں ہوتا۔ اگر معنی کے پس پشت صداقت نہ ہو تو بڑے بڑے معنی بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس بات کا تجربہ کم و بیش ہر شخص کو ہوتا ہے کہ ایک شخص مخصوص الفاظ پر مشتمل ایک پیغام دیتا ہے تو اس کا اثر نہیں ہوتا لیکن جب دوسرا شخص انہی الفاظ پر مشتمل پیغام کو دوسرے تک منتقل کرتا ہے تو اس کا اثر ہوتا ہے اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ابلاغ الفاظ اور معنی کا ہوتا ہے تو پھر دونوں صورتوں میں پیغام کا اثر یکساں ہونا چاہیے۔ یہ کیا چیز ہے جو ایک پیغام کو موثر بناتی ہے؟ یہ صرف صداقت ہے اور کچھ نہیں، ہمارے نزدیک جس کے اندر جتنی زیادہ صداقت ہوتی ہے اس کا پیغام اتنا ہی زیادہ موثر اور دیر پا ہوتا ہے۔

حرف بے صداقت سے صرف شور ہی نہیں ایک اور چیز بھی پیدا ہوتی ہے یہ وہ چیز ہے جسے ہم اپنی اصطلاح میں روحانی آلودگی (Spiritual Pollution) کہتے ہیں۔ گاڑیوں کے شور کی آلودگی یعنی (Noise Pollution) سے سماعت متاثر ہوتی ہے۔ روحانی آلودگی سے سماعت حق کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ انسان اگر حق کی سماعت کی صلاحیت سے محروم ہو جائے تو باقی باتوں کی سماعت کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

پانچ چھ ہزار سالہ انسانی تاریخ کے پس منظر میں آنحضرت ﷺ کی بعثت تو حال ہی کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت عیسیٰ کی بعثت کو تو ہزاروں سال ہو گئے ہیں۔ آپ کو ماننے والوں نے آپ کے پیغام میں بے شمار تبدیلیاں بھی کر ڈالی ہیں مگر آپ کا پیغام آج تک زندہ ہے۔ اس کے برعکس گزشتہ تین ہزار سال میں سیکڑوں فلسفی پیدا ہوئے اور ایک صدی میں مکمل طور پر رد ہو کر رہ گئے حالانکہ انہوں نے ہر بال کی کھال اتار دی ہے چنانچہ یہ کیا بات ہے کہ ایک روایت (مسیحی مذہب) تبدیل بلکہ منہ ہونے کے باوجود بھی کروڑوں لوگوں کے قلوب میں جاں گزریں ہے اور ایک روایت (فلسفیوں کی) تردد در تردد

کے ایک طویل سلسلے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ہماری رائے میں ہمارے یہاں خیر کی قوتوں کی بے اثری کا ایک اور سبب بھی ہے اور وہ بہت اہم ہے کہ ان قوتوں کے عمل و رد عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خیر کو پھیلانے کے ٹھیکے داری بن گئے ہیں۔ خیر سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر کسی کی فوقیت نہیں۔ ہر خیر آخرت کی کامیابی کی طرف لے جاتا ہے۔ ہر خیر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا امت کو مطلوب ہے لہذا کسی خیر کو کسی خیر پر بلاوجہ فوقیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک استاد جو طالب علم کو نورانی قاعدہ پڑھا رہا ہے اور ایک دوسرا استاد جو طالب علم کو حدیث پڑھا رہا ہے، کم تر اور برتر نہیں ہیں۔ نورانی قاعدہ پڑھانے والا استاد بھی اہم ہے اور حدیث پڑھانے والا بھی اہم۔ ہمیں دونوں کی ضرورت ہے، دونوں کے بغیر دین کی تصویر مکمل نہیں ہوتی اور کسی کو کسی پر برتری کا دعویٰ کرنے کی ضرورت نہیں، ہر راسخ العقیدہ اصلاحی، انقلابی، جہادی، سیاسی تحریک اپنے اپنے مقام پر اہمیت کی حامل ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ چن میں ہر پھول اپنی جگہ اہم ہے۔ قسم قسم کے پھول نہ ہوں تو چمن میں حسن کا منظر کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔

دینی کاموں اور تحریکوں میں تفریق کی نہیں تطبیق کی ضرورت ہے۔ اپنے کام کو دوسرے کے کام سے بہتر، برتر اور اہم تر سمجھنا، دوسرے کے کام کو حقیر کہنا اور اس کی تضحیک، تذلیل، تردید، تمسخر، غیر علمی تنقید کرنا، سب کاموں پر صرف اپنے کام کو فوقیت دینا، اہل دین کا طریقہ نہیں۔ دین میں مقابلہ نہیں رشتہ ہوتا ہے۔ مسابقت نہیں محبت ہوتی ہے۔ دین کے تمام کام اہم ہیں ہر کام دوسرے کام سے مربوط ہوئے بغیر اپنا اثر نہیں دکھا سکتا۔ تمام راسخ العقیدہ مخلصانہ دینی کام قابل توجہ اور قابل محبت ہیں۔ ان کی مثال مختلف پھولوں کی سی ہے جن سے مل کر گلہ سستہ بن جاتا ہے۔ اگر پھول الگ الگ ہوں وحدت میں نہ ہوں، اجزاء منتشر ہوں تو یہ کثرت بے اثر رہتی ہے۔ پھول تنہا ہوتا بھی اس کا ایک اثر ہوتا ہے لیکن یہی پھول جب اپنی انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت کا حصہ بنتا ہے، کثرت وحدت میں اور وحدت کثرت میں ڈھلتی ہے تو امت طاقت ور ہوتی ہے۔ یہ سب ایک کل کے اجزاء، ایک سمندر کے قطرے ایک آسمان کے تارے اور ایک صحراء کے ذرے ہیں..... جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ اپنے کام، اپنے طریقے کو دوسرے سے برتر قرار دینا صحیح رویہ نہیں۔ یہ محض ٹھیکے داری ہے۔ روزِ اول یہی کہا گیا تھا 'انسا خیر منہ' میں اس سے بہتر ہوں، وہ مٹی سے بنایا گیا ہے میں آگ سے تیار کیا گیا ہوں۔ یہی فخر و غرور گمراہی کا سبب بنا۔

جب ہم محبت، رافت، رحمت، مودت کے جذبات سے محروم ہو جائیں تو ٹھیکے داری شروع ہو جاتی ہے۔ ٹھیکے داری کے جذبے میں اکثر و بیشتر خیر سے زیادہ اہم خیر پھیلانے والے کی شخصیت بن جاتی

ہے۔ یہ شخصیت ایک فرد کی بھی ہو سکتی ہے اور کسی اجتماع کی بھی۔ نتیجتاً ہمارے مفادات خیر کے مفادات بن جاتے ہیں۔ ہمارے رویے خیر کے رویے قرار پاتے ہیں یوں خیر یا صداقت کا دائرہ اثر محدود ہونے لگتا ہے۔ اس صورت حال میں دوطرفہ ردِ عمل وجود میں آتا ہے۔ ایک طرف خیر کا دائرہ محدود ہونے لگتا ہے اور دوسری طرف صداقت سے محروم ہو کر الفاظ شر میں ڈھل کر روحانی کثافت پھیلانے کا سبب بننے لگتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ہر روز صداقت سے محروم اربوں الفاظ فضا میں تحلیل ہوتے ہوں اس معاشرے میں روحانی کثافت کے پھیلاؤ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ہمارا معاشرہ ایک ایسا ہی معاشرہ ہے۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا پیغام موثر ہو تو ہمیں سمجھنا ہوگا کہ پیغام کی ترسیل کے کوئی معنی نہیں۔ معنی ہیں صرف صداقت کی ترسیل کے۔ اگر آپ کے اندر یہ صداقت ہوگی تو آپ کے پیغام کی راہ روکنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہوگا اور اگر آپ کے اندر یہ صداقت نہیں ہوگی تو پھر آپ کا پیغام الفاظ کی ایک منظم ترتیب کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور الفاظ کی منظم ترتیب نے آج تک کسی دل پر دستک نہیں دی۔

یہ بات کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہیے کہ ہر راسخ العقیدہ دینی جماعت سر اسر خیر ہے اگر وہ خود کو الحق تصور نہ کرے اور دوسرے کو الباطل قرار نہ دے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ عظیم دینی جماعتوں کے اثرات کیوں ظاہر نہیں ہو رہے اور بڑے بڑے دینی کام بھی بے اثر کیوں ہو گئے ہیں؟ اس کی وجہ ہماری وہ کمزوریاں ہیں جن کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے۔ دو کروڑ روپے کی نئی مرسدیز گاڑی کا نمبر آپ نکال کر رکھ دیں تو گاڑی کا حسن کم ہلا جائے گا، نہایت بری لگے گی۔ آخر یہ کیا ہو گیا؟ اتنی سی تبدیلی نے کیا انقلاب پیدا کر دیا؟ گیارہ لاکھ کی کلش کا بمپر صرف پندرہ سو روپے کا ملتا ہے۔ یہ بمپر بنادیں تو اس کی خوبصورتی ماند پڑ جائے گی۔ کروڑوں روپے کے ہوائی جہاز میں اگر چند ہزار روپے کا پٹرول نہ ڈالا جائے تو جہاز بے کار ہو جائے گا۔ پانچ کروڑ کی نئی گاڑی کا فیوز خراب ہو تو گاڑی نہیں چلے گی۔ نئی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں آپ مفت کا پانی ڈالنا بھول جائیں تو انجن بار بار بند ہوگا گاڑی نہیں چل سکے گی۔ اس گاڑی کو چلانے کا صرف ایک راز ہے کہ اس کے ریڈی ایٹر میں مفت کا پانی ڈالا جائے۔ اگر یہ کام نہیں کیا گیا تو قیمتی گاڑی بے کار ہو جائے گی۔ ایک ارب کی گاڑی کی بیڑی کا ٹرمینل اگر ڈھیلا ہو تو گاڑی کھڑی رہے گی، ہلنے جلنے کے قابل نہ ہوگی۔ یہ چھوٹی چھوٹی خامیاں کمزوریاں ایک نئی بہترین عظیم الشان گاڑی اور ہوائی جہاز کو ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی کمزوریاں ہی ہماری مخلص، بے مثال، باکمال دینی جماعتوں کی اثر پذیری میں اصل رکاوٹ ہیں۔ ہمیں ان کا احساس ہی نہیں۔ ان کمزوریوں کو ایک لمحے میں رفع کیا جاسکتا ہے۔ ایک دوسرے سے مقابلہ کی بجائے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور ہمدردی و مودت کا رویہ اختیار کیا جائے تو چمن آتش گل سے دہکنے لگے گا۔

دینی جماعتوں کو ایک دوسرے کے بارے میں حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیمؑ کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عیسائیوں کے خلاف شرک کا مقدمہ پیش کر کے حضرت عیسیٰ سے پوچھیں گے کہ کیا آپ نے انہیں شرک کا حکم دیا تھا؟ تو حضرت عیسیٰ اپنی شرک امت کے جرم کا اقرار کرنے اور اس سے اپنی لاطیفی کا اعلان کرنے کے بعد اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اپنی شرک امت کی مغفرت کی خواہش کا اظہار کریں گے اور کہیں گے کہ آپ سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔ سورہ مائدہ میں آتا ہے: مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ عِبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ إِنَّ تَعَذُّبَهُمْ فَأَنْتُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ [۱۸۸، ۱۱۷:۵] حضرت عیسیٰ کی امت بلاشبہ شرک ہے مگر میدان حشر میں حضرت عیسیٰ اس شرک امت کے لیے اللہ کی رحمت کے طالب ہیں۔

یہی حال حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ آپ اللہ سے اپنی مکمل گمراہ امت کے لیے بددعا نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں: اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ اے اللہ جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُمْ أَضَلُّونَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعْنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ [۳۶، ۳۵:۱۴] حضرت ابراہیمؑ کی اپنی آنے والی گمراہ امت کے لیے یہ آرزو کہ اے اللہ آپ مشرکین کا راستہ اختیار کرنے والوں پر رحمت فرمائیں اور درگزر کا معاملہ کریں، امت سے ان کے تعلق اور محبت کی علامت ہے۔ یہی محبت رسالت مآب ﷺ کو اپنی امت سے تھی۔ جب اہل مکہ اسلام قبول نہیں کر رہے تھے تو اس غم میں آپ ﷺ گھل رہے تھے۔ تب اللہ نے فرمایا کہ اے محمد ﷺ، کیا آپ ان کے غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے؟ باخبر نفسک آپ ان کو ہدایت نہیں دے سکتے، یہ ہدایت کے طالب ہی نہیں لہذا ہم نے ان کے دل پر مہر لگا دی ہے۔ پیغمبر کی محبت ایسی ہوتی ہے تو پیغمبر کے ماننے والوں کی محبت کیسی ہونی چاہیے؟ رحمت للعالمین ﷺ کی امت کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ مگر اس کا طریقہ عملاً کیا ہے؟

رحمت سید لولاکؑ پہ کامل ایمان امت سید لولاکؑ سے خوف آتا ہے

تمام اسلامی مکاتب فکر کو ایک دوسرے کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور رحمت للعالمین حضرت محمد ﷺ کا رویہ اختیار کرنا چاہیے کیوں کہ تمام اسلامی مکاتب بہر حال یہود و نصاریٰ سے بدتر نہیں ہیں۔ امت کے تمام گروہوں سے محبت اور عدل رحمت للعالمین ﷺ کے لائے ہوئے دین کا خلاصہ اور حاصل ہے۔ افسوس کہ دین کی ایسی تمام صورتیں ہمارے لیے ناممکن ہوتی جا رہی ہیں۔

## تفسیر البلاغ

اس تفسیر کے مفسر مولانا محمد رفیق چودھری صاحب کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ درس نظامی کے فارغ التحصیل ہیں اور نہ صرف جدید علوم سے واقف ہیں بلکہ ابتدائے عمر میں انہیں کچھ عرصہ تک جاوید غامدی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا اور وہ علی وجہ البصیرت ان کی فکری غلطیوں پر متنبہ ہوئے اور ان کے علمی حلقہ کو چھوڑ آئے تاہم ان کی بعض خوبیوں کو ساتھ لیتے آئے۔ الحمد للہ! وہ دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہیں محنتی ہیں اور بے شمار دینی تالیفات کے مولف ہیں۔ اس سے پیشتر وہ تفسیری ترجمہ قرآن مرتب کرنے کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ تفسیر البلاغ میں وہ عربیت سے اعتناء کرتے ہیں، ان کا اسلوب سادہ اور پرکشش ہے۔ جدید تعلیم یافتہ لوگ خصوصاً وہ جو قرآن فہمی کے ساتھ عربی زبان کی کچھ استعداد بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں یا کچھ استعداد رکھتے ہیں اور اسے بڑھانا چاہتے ہیں تو تفسیر البلاغ ان کے لیے مدد ثابت ہوگی۔ اس تفسیر میں بلاشبہ مندرجہ ذیل خوبیاں موجود ہیں:

☆ یہ تفسیر آسان اور عام فہم اردو زبان میں لکھی گئی ہے ☆ اس میں قرآنی / مشکل الفاظ کے معانی اور اُن کی تشریح الگ سے کی گئی ہے ☆ اس میں تفسیر کے علاوہ آیات کے نظائر و شواہد (precedents) دیے گئے ہیں کیونکہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے ☆ اس میں صحیح احادیث کے مکمل حوالے چابجا ملتے ہیں ☆ یہ تفسیر اجماع امت اور دینی مسلمات کے بالکل مطابق ہے ☆ اس میں قرآنی احکام کی تفسیر کرتے ہوئے تمام مسالک کا لحاظ رکھا گیا ہے ☆ اس میں متجددین، منکرین حدیث اور دوسرے گمراہ طبقوں کی غلط تاویلوں کا محاسبہ کیا گیا ہے ☆ اس میں دور جدید کی ضروریات اور نئے مسائل کو پیش نظر رکھا گیا ہے ☆ یہ تفسیر قدیم و جدید دونوں طرح کے اسلوبوں کا حسین امتزاج ہے ☆ اس کے مخاطبین میں جدید تعلیم یافتہ اور دینی طبقہ دونوں شامل ہیں۔

تفسیر البلاغ کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں اور مکتبہ قرآنیات، اردو بازار، لاہور (فون 0321-7724032, 0333-4399812) سے مل سکتی ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد رفیق صاحب کو اس تفسیر کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں اجر جزیل سے نوازے۔

## امریکہ اور یورپ میں عورتوں کی حالتِ زار

تالیف ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

معروف دینی دانشور اور مصنف و مولف کتب کثیرہ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب نے ان لوگوں پر احسان عظیم کیا ہے جو مغرب پر فریفتہ ہیں اور تہذیبِ حاضر کی ظاہری چمک دمک نے جن کی آنکھیں خیرہ کر رکھی ہیں۔ اس کتابچے میں ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۱۱ء (باقی صفحہ ۳۹ پر)



































































































































































































































































